خوشونت سنگھ
کے
بہترین افسانے
PLAYBOY
ترجمہ و ترتیب
آصف نواز

# خوشونت سنگھ کے بہترین افسانے

خوشونت سنگھ

مترجم وترتیب: آصف نواز

مکتبہ شعروادب ▪ سمن آباد ▪ لاہور
E-mail: muktabashair_o_adab@hotmail.com

# ترتیب


| | |
|---|---|
| بھولا بادشاہ (اجیت کور) | 7 |
| دیباچہ (کرتار سنگھ دُگل) | 35 |
| جب دولت رام مرا | 41 |
| کالی چمبیلی | 49 |
| کیا نزدیک کیا دُور | 63 |
| ناستک (ملحد) | 71 |
| صاحب کی بیوی | 79 |
| ریپ | 103 |
| دیکھو کیسے چلتی ہے بھارت کی سرکار | 113 |
| جب سکھ سکھ سے ملتا ہے | 127 |
| مسٹر کنجوس اور ان کا کرشمہ | 135 |
| لندن میں ایک عشقیہ موقع | 145 |
| مانڈلے کی میم صاحب | 155 |
| تتلی | 167 |
| مرنے کے بعد | 181 |

The plot seems okay—but could he write good English...?
SHAKESPEARE
COLLECTED WORKS
PLAYBOY

# بھولا بادشاہ

"میں اٹلی میں تھا۔ ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاردالیک کے کنارے' بڑی ہائی وے پر۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ تپی ہوئی گرمی۔ سلیٹی سڑک' جیسے کھولتے گرم سورج کے نیچے پگھلتی جا رہی ہو۔ پیاس سے بے حال' گرم دھوپ اور ہوا اور ہونکتی سڑک کی گرمی سے گھبرا کر میں سڑک کے کنارے آباد ہر قصبے' ہر شہر میں ہوٹل تلاش کرتا' لیکن ٹورسٹ سیزن تھا' کسی ہوٹل میں کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔

"پریشان' گرمی میں جھلسا' پیاس اور تھکاوٹ سے ٹوٹا میں شہر در شہر بھٹک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا' ساری دنیا ایک تپتی ہوئی بھٹی بن گئی ہے' جس میں میرے واسطے کوئی ٹھنڈا کونہ باقی نہیں بچا۔

"اچانک وہ سڑک جھیل کے اندر کی طرف مڑی۔ میں نے گاڑی اس پر موڑ لی۔ جھیل کے درمیان وہ سڑک دور تک چلی گئی۔ اکیلی' سنسان۔ سوچا تھا' شاید اس سڑک پر کوئی ہوا کا ٹھنڈا سانس نصیب ہو گا۔ لیکن جھیل کا پانی بھی جیسے کھول رہا تھا' اور اس کی بھاپ سڑک کی ہونکتی گرم باس سے مل گئی تھی۔ میرا سانس میری پسلیوں کے اندر گرم ریت کے پھانکوں کی طرح آجا رہا تھا۔۔۔ اور پھیپھڑے' لگتا تھا' لوہار کی بھٹی کی دھونکنی بن گئے ہیں۔

"چھ سات میل اسی طرح اس سڑک پر گاڑی چلتی رہی۔ آگے ایک چھوٹا سا جزیرہ آگیا۔ سین سرمیو اونے۔ ٹھگنی سی پہاڑیاں' مچھیروں کے کچھ گھر' اور ایک چھوٹا سا ہوٹل۔ اس ہوٹل میں کبھی کبھار ہی شاید کوئی آتا تھا۔ کمرہ مل گیا۔

"نہا دھو کر میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ شام اتر رہی تھی۔ گرمی سے کھولتی ہوا ذرا سی ٹھنڈی ہونی شروع ہو گئی تھی۔ ہوٹل کے باہر دور تک سبزہ زار چیلوں کے درخت تھے۔ میرے پاؤں مجھے ان درختوں کی طرف لے چلے۔

"بے انتہا تھکاوٹ تھی۔ چیل کے ایک درخت کے نیچے جاکر میں لیٹ گیا۔ درختوں کی چھاؤں' نرم لہراتی ہوا' دور جھیل کی لہروں کا نرم سا شور' کجلایا' سرمئی آسمان' میری آنکھ لگ گئی۔

"تبھی محسوس ہوا' کوئی تیز روشنی والی ٹارچ میرے چہرے پر پھینک رہا ہے۔ تیکھی' شفاف روشنی سے میری بند آنکھیں بھی چندھیا گئیں' اور میں ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ دیکھا' اوپر چیل کے درخت کے دوسری طرف' شاخوں کے اوپر سے پورا چاند' تیز' شوخ' سفید روشنی کی گاگر کی گاگر میرے اوپر انڈیل رہا ہے۔ سفید بہت ہی سفید روشنی۔

"اور چیل کے درخت کی شاخ پر بیٹھی کوئی نائٹ انگل گا رہی تھی۔ عجیب خمار میں' مستی میں۔

"مچھیرے گھر لوٹ رہے تھے۔ خوش! دن بھر کی محنت سے پکڑی مچھلیوں کے خوشنما بوجھ تلے ہلکے پھلکے۔ کوئی گٹار بجا رہا تھا' ہلکے سروں میں۔ کئی گا رہے تھے' اور ان کی گاتی آوازوں میں جھیل کی لہروں کی موسیقی بھی شامل تھی۔

"گہرے سیاہ آسمان میں سے ستارے جیسے اڑ کر مجھے ہی دیکھ رہے تھے' ایک پردیسی کو۔ لیکن میں تو وہاں پردیسی نہیں تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا' جیسے میں تو پیدا ہی یہاں ہوا تھا' ان چیل کے درختوں کے نیچے۔ وسیع جھیل کے کنارے کھیل کود کر بڑا ہوا تھا۔ اور آج میں بھی مچھلیاں پکڑ کر واپس آیا تھا--- میٹھی تھکاوٹ سے خمار زدہ۔ یہ چاند صرف میرے لئے ہی چمک رہا تھا۔ ستارے صرف مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ نائٹ انگل صرف میرے لئے ہی گا رہی تھی' اور چاندنی کے لمس سے کانپتی جھیل کی لہریں میرے ہی لمس کے لئے بیتشن میں پگھلی کانپ رہی تھیں۔

"شاید میں کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ اس لمحے کے جادو نے مجھے مسحور کر دیا تھا۔ قدرت کے بے انتہا حسن کے جادو سے مدہوش میں اپنے وجود سے اوپر اٹھ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم' یہ خدا کیا چیز ہے۔ مجھے نہیں معلوم جسم سے پرے بھی کوئی وجود ہے

کہ نہیں۔ لیکن اس لمحے میں جسم سے پرے کسی غیر محسوس وجود میں کھو گیا تھا۔ انتہا کی خماری! عجیب عالم تھا۔ احساس اتنا شدید تھا' اور شفاف چمکیلا' کہ چیل کے سوئیوں جیسے سبز پتے کی جنبش' جھیل کی ہر لہر کی لرزش' میرے اپنے وجود کی تھرکتی لرزتی کانپتی کی ہی وسعت تھی۔ ویسے میں ہوش کے دوسری طرف تھا۔ قدرت کے اتنے اتھاہ حسن کے سامنے گونگا۔ مجھے لگتا تھا میں اپنی انگلی بھی نہیں ہلا سکتا۔ مکمل ٹرانس کی حالت۔ عجیب مخموری' مدہوشی۔"

اور وہ خاموش ہو جاتا ہے۔

میں خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتی ہوں---

..........

اس شخص کو آپ پہچان سکتے ہیں؟

یہ وہی ہے' جس کو سب "بدمعاش" کہتے ہیں' اس کو شاید ننگے جسموں سے اور سیکس کے علاوہ اور کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔ "ڈرٹی اولڈ مین"۔

یہ خوشونت سنگھ ہے۔

میں اس کو "دی خشونت سنگھ" کہتی ہوں' کیونکہ پوری دنیا میں صرف ایک ہی خشونت سنگھ ہے۔ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

☆☆☆☆☆

میں ایک دفعہ خوشونت سنگھ کو کسی پارٹی میں ملی تھی۔ شاید کوئی بیس برس پہلے۔

"گھر آؤ نہ کبھی۔" اس نے بڑی گرم اور پر خلوص بے تکلفی کے ساتھ کہا۔

اس سے کچھ عرصہ پہلے اس نے پنجابی افسانوں کی ایک ا-ینتھالوجی ایڈٹ کی تھی' اور میرا افسانہ اس میں شامل نہیں تھا۔ اس لئے پہلے تو دل کیا' کہ کہوں' اگر تمہیں میرا افسانہ پسند نہیں' تو میں کیوں تمہارے گھر آؤں؟ پھر سوچا' شاید اپنے گناہ کی تلافی کے لئے ہی بلا رہا ہے۔

اور غلط فہمیوں میں زندہ رہنا بڑی مزیدار چیز ہے' دوستو۔ اس لئے فوراً" یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ شاید جب وہ ا-ینتھالوجی ایڈٹ کر رہا تھا' ابھی اس نے میرے افسانے نہ پڑھے ہوں' اب ہی کہیں پڑھے ہوں۔ اس لئے گھر بلا رہا ہے۔

بہرحال اس میں کوئی شک نہیں' اور نہ ہی اقبال کرنے میں مجھے ہچکچاہٹ ہے کہ

اس کی بات سے مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک ہاتھ اونچی ہو گئی تھی۔

آخر خود خوشونت سنگھ مجھے اپنے گھر آنے کے لئے کہہ رہا تھا۔ یہ کوئی چھوٹی سی بات ہے؟

دو چار دن کے بعد فون کیا' اور اس کے گھر چلی گئی۔

اس بات کو اتنے برس ہو گئے ہیں۔ اس کے گھر کی زیادہ یاد باقی نہیں رہی۔ (اور اس کے بعد اس نے کبھی بلایا ہی نہیں۔ شاید اس کی بیوی کو میں پسند نہ آئی ہوں)۔ صرف وہ کونہ یاد ہے' جس میں خوشونت سنگھ بیٹھا تھا۔ کمرے کے دائیں کونے میں۔ یاد کی ساری سپاٹ لائٹ صرف ایک چہرے پر جاکر پڑتی ہے اور تیز روشنی میں وہ کلوز اپ آج بھی جیسے میرے پاس بیٹھا ہے' اسی طرح کا اسی طرح۔ (نہیں دوستو' اس میں جذباتیت والی کوئی بات نہیں) اور تیز روشنی میں لئے کلوزاپ کی بیک گراؤنڈ ہمیشہ سیاہ کالی ہو جاتی ہے۔

اس وقت خوشونت اب سے کچھ بھاری تھا۔ موٹا نہیں' صرف گدرایا ہوا۔ اور اس کا چہرہ گول تھا۔ پگڑی اب جیسی ہی ڈھیلی' بیٹھی سی۔ لاپرواہی سے پہنے ہوئے کپڑے۔ مست دریا جیسے گال۔

جب میں کمرے میں داخل ہوئی' وہ سامنے میز پر باریک ٹائپ والے گورو گرنتھ صاحب کی سینچی کھول کر بیٹھا تھا' اور پنسل سے نشان لگا رہا تھا۔ ساتھ والی میز پر ایک گلاس پڑا تھا' جس میں سیاہ گارنیٹس کے رنگ کی شراب تھی۔

اگر مجھے ٹھیک یاد ہے' اس وقت خوشونت کم پیا کرتا تھا۔ کہنے لگا ''رم پیو گی؟'' میں نے کہا ''نہیں ابھی پینی نہیں سیکھی۔'' ''اور کیا پیو گی؟ جن اینڈ لائم؟'' میں اسی طرح جھینپ رہی تھی' جیسے گناہ کا اقبال کر رہی ہوں' ''نہیں خوشونت' مجھے کچھ بھی پینا نہیں آتا' سوائے کوکا کولا کے۔''۔ ''پینا نہیں آتا' تو لکھتی کس طرح ہو؟''___ جیسے کہہ رہا ہو' چلنا نہیں آتا' تو بھاگ کس طرح لو گی؟

لگتا ہے کہ یا تو اس کی بیوی نے کہا ہو گا' ''خبردار اس عورت کو دوبارہ میرے گھر کی دہلیزیں پار کرنے دیں تو۔'' کیونکہ عورت چاہے کتنی بھی فراخ دل کیوں نہ ہو' دوسری عورت جب خطرہ بن کر نظر آئے' چاہے بالکل بوسیدہ سا' پل دو پل کا خطرہ ہی کیوں نہ ہو' تو برداشت نہیں کر سکتی۔ یا تو اس کو یہ خطرہ میری آنکھوں میں سے نظر

آگیا تھا' کیونکہ اقبال کرتی ہوں' کہ خوشونت مجھے بے حد خوشنما شخص نظر آیا تھا۔ اس طرح کے لوگ بہت کم نظر آتے ہیں۔ عام طور پر خوشونت کے رتبے پر پہنچے لوگ ماسک پہنے رکھتے ہیں۔۔۔ ایک عجیب بدحواس بوکھلاہٹ کا' یا مصروفیت کا' یا نچلی دنیا کو ایورسٹ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھنے کا۔ لیکن خوشونت۔۔۔ جیسے جنگل کی ہوا ہو۔۔۔ آزاد' الست' جنگلوں کی آوارہ خوشبو سے لدی' تتلیوں کی طرح اڑتی۔

یا ہو سکتا ہے' خوشونت کو ہی میں بے عقل اور بور لگی ہوں۔

بہرحال' اس نے دوبارہ کبھی مجھ کو گھر نہیں بلایا۔ اور میرا تو اس کو کہیں بلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس وقت ذرا زیادہ ہی خانہ بدوش تھی۔ یعنی گھر بالکل ندارد تھا۔ فٹ پاتھوں پر رہنے والی پھٹے حال حالت تھی۔

یوں حالت اتنی خستہ اور اتنی نازک تھی اور اکیلے پن کی تنہائی اتنی خوفناک تھی کہ اگر خوشونت تھوڑی سی بھی ہمت کرتا' تو ایک عدد عشق ہو سکتا تھا۔

لیکن آپ کو بتایا ہے نا' خوشونت بہت ہی دبو قسم کا آدمی ہے۔ آج تک اس نے جتنے بھی عشق کئے ہوں' میں دعویٰ سے کہہ سکتی ہوں' ہمیشہ عورتوں نے ہی اس کو ورغلایا ہو گا' اور وہ اغوا کی ہوئی عورت کی طرح خاموشی سے عشق برداشت کر لیتا ہو گا۔

☆☆☆☆☆

میں نے اس کو ایک دفعہ پوچھا' "تم نے کتنی دفعہ عشق کیا ہے؟"

"یعنی؟"

"یعنی کچھ نہیں۔ حساب کا سوال نہیں پوچھ رہی۔ صرف عشق کے بارے۔۔۔"

وہ سنبھل گیا' "بے انتہا دفعہ۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ' کہ کئی دفعہ' کئی جگہوں اور کئی مقامات پر۔۔۔"

"عشق کا مطلب سمجھتے ہو؟"

"خدارا' اب کہیں یہ نہ کہنا' کہ پنجابی شاعروں کی طرح تم بھی یہی سمجھتی ہو' کہ بس ایک دفعہ جو عشق ہو جائے' وہ اگلے جنم بھی رہتا ہے۔" (یہ اس طرح جیسے رامائن کی کتھا ہو رہی ہو)۔

"بھول گئے؟ میں شاعر نہیں' قصہ گو ہوں۔"

"لیکن ہو تو پنجابی ہی کی۔"

"پنجابی سے اتنی رسوائی کیوں جناب؟"

"پنجابی---"___ نہایت مایوس' باسی آواز!"

"پنجاب کا کوئی ادیب آپ کو اچھا بھی لگتا ہے؟"

"نہیں۔"

اب بتا' کیا کر لے گا' اس طرح کے جواب کے آگے؟

☆☆☆☆☆

خیر' بتا رہی تھی' آپ کو خوشونت سنگھ کے ساتھ ملاقات بارے۔

پھر کئی سال گزر گئے۔

اس دوران صرف ایک شخص سے اس کی خیر خیریت کی خبر ملتی رہی۔ ستی سے۔ ستی' یعنی ستندر سنگھ۔

کئی دفعہ خوشونت کی بات کرتا کرتا ستی بالکل جذباتی ہو جاتا ہے' جس طرح کوئی دیہاتی ماں اپنے ولایت پلٹ بیٹے بارے بات کرے' یا کوئی ان پڑھ گھریلو بیوی اپنے نئے نئے لاٹ گورنر بنے خاوند بارے بات کرتی ہو۔ "خوشونت نے اپنا مینو سکرپٹ میرے پاس بھیجا ہوا ہے' پڑھنے کے لئے۔ آج کل تو میں ایک منٹ کے لئے بھی کہیں نہیں جا آسکتا۔ تیرے گھر کھانا کھانے آئندہ ہفتے آؤں گا---"

"خوشونت کے گھر ہفتے کے روز میں نے کھانا کھانے جانا ہے۔ ہفتے میں ایک شام تو میری اس کے لئے ریزروڈ ہے ہی---" مالا کا جنم دن ہے نا' اور مجھے ایک "ودکا" ضرور چاہئے۔ میری مدد کرو نا۔ تمہارے روسی دوست---"

"مالا؟ مالا کون؟"

"تمہیں نہیں معلوم؟ ما--- لا--- اپنے خوشونت کی بیٹی۔ یعنی میری اپنی بیٹی۔" خوشونت رات کو آیا تھا' سوپ لے کر۔ اس کو فوراً" معلوم ہو جاتا ہے کہ میں بیمار ہوں۔" اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔

اس طرح کا جذباتی اس کو میں نے صرف خوشونت بارے دیکھا ہے' اور روی بارے' اور دیو آنند بارے۔

کبھی کبھی میں اپنی کمینگی کے عالم میں سوچا کرتی تھی' "اس سالے ستی کو بھی جذباتی ہونے کے لئے صرف خاص لوگ ہی نظر آتے ہیں۔ یا وہ خوشونت سنگھ ہوں' یا دیو آنند۔ قوئی! چھچہ!"

دیو آنند کو تو کبھی ملی نہیں' لیکن خوشونت کو مل کر لگتا ہے' ستی سچا ہے۔ خوشونت ہے ہی پیار کرنے کے قابل۔

☆☆☆☆☆

بتاؤ' ملاقات کی بات پھر درمیان میں ہی رہ گئی۔ تو بڑے سال گزر گئے۔ اس دوران ہم صرف نئے سال کا خط ایک دوسرے کو لکھتے رہے۔

وہ بمبئی چلا گیا۔ نئے سال کے ایک خط میں لکھا تھا' "کبھی کبھی آنا ہو' تو ملنا۔"

میں نے جواب دے دیا' "دہلی تو آتے ہی رہتے ہو گے' کبھی فرصت ملے تو' ملنا۔"

لیکن یہ سب تو رسمی الفاظی تھی۔

..........

بمبئی میں کئی دفعہ جاتی تھی' لیکن خوشونت کے گھر جانے کی' جو ایک ہچکچاہٹ تھی' وہ بدستور قائم تھی۔

تب ہی وہ ایک دن مجھے فیروز شاہ مہتہ روڈ کے برآمدے میں ساڑھے پانچ بجے کے قریب ٹہلتا ہوا مل گیا۔

سڑک پر' اور برآمدے میں بے حد بھیڑ تھی۔ پھیری والوں میں سے نکلنے کا راستہ مشکل سے مل رہا تھا۔ سامنے سے خوشونت سنگھ جھولتا ہوا چلا آرہا تھا' جیسے سنسان جنگل میں ایک ہی مست ہاتھی چلا آرہا ہو۔ ڈھیلی سی پتلون' سلوٹوں والی قمیض' مختصر سی پگڑی' کندھے پر لاٹھی کی طرح رکھی ہوئی چھتری۔ اس کو تو میں نے پہچاننا ہی تھا' کیونکہ وہ خوشونت سنگھ تھا' لیکن اس نے مجھے اتنے سالوں کے بعد کس طرح پہچان لیا' اس بات کا تعلق بھی اس کے ساتھ وابستہ کرشمات میں شامل ہے۔

تپاک' گرم جوشی' خلوص۔ لگتا ہے' سردیوں کی ٹھنڈی برفانی صبح کو ٹھنڈے یخ پانی سے نہاکر' کانپتے ہوئے آپ دھوپ میں بیٹھ گئے ہوں۔

☆☆☆☆☆

پھر کئی سال گزر گئے۔

اس کی ساری گرم جوشی اور خلوص کے باوجود میری ہچکچاہٹ ابھی بھی قائم تھی۔

وہ بمبئی میں تھا۔ اس کی بیوی کنول کو میں کئی دفعہ لودھی گارڈن کی طرف سیر کرتے دیکھتی۔ وہ لمبی، پتلی، رعب دار، بانکی پوٹھوہارن۔ ہمیشہ تنگ پائنچوں والی شلوار، اور ریب کٹ گھیرے والا لمبا کرتہ۔ لمبے پراندے میں بندھی بالوں کی چوٹی۔ جب وہ چلتی، زمین دھمکتی۔

خوشونت کی بیوی بے حد خوبصورت ہے۔

وہ کہتا ہے، اس کو وہ لندن میں ملی تھی۔

"اس وقت وہ بہت ہی خوبصورت ہوتی تھی۔ لندن میں آدھے ہندوستانی لڑکے اس پر عاشق تھے۔ میں بھی عاشق ہو گیا۔ اور پھر یہ میری عزت کا سوال بن گیا--- اس کو ان سب سے جیت کر لانا ہی تھا۔ اس لئے میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔"

ویسے ہے کنول پوٹھو ہارن سردارنی۔ اور اس حساب سے کافی نادر شاہی طبیعت اس نے پائی ہے۔ اسی لئے تو اس نے سردار بہادر سردار سرسوبھا سنگھ کے اس انتہا کے ذہین بیٹے کو اتنے سالوں سے اپنے گھٹنے کے پاس بٹھایا ہوا ہے۔ ورنہ---

وہ خود کہتا ہے، "ہے وہ بے حد سخت۔ خاص کر میرے سونے جاگنے کے معاملے میں۔ مجھے ملنے آئے اور مجھے گھر بلانے والوں لوگوں کے لئے۔ کئی دفعہ میں سوچتا، اگر وہ اتنی سخت نہ ہوتی، اور آئے گئے کو اس طرح ڈرا کر نہ رکھتی، تو میں کبھی بھی اتنا کام نہیں کر سکتا تھا۔ چاہے خدا بھی آجائے، وہ رات کو نو بجے سب کو ڈانٹ کر باہر نکال دیتی ہے۔ چاہے ہم کہیں بھی جائیں، وہ میزبانوں پر پہلے ہی حکم چلا دیتی ہے کہ کھانا ہم پورے ساڑھے آٹھ بجے کھائیں گے، اور نو بجے رخصت ہو جائیں گے۔ اس کے اس ڈسپلن کے صدقہ ہی، میں بروقت سو جاتا ہوں اور صبح چار بجے اٹھ کر کام کرنا شروع کر دیتا ہوں۔ میرا کام، میری سیر، میری صحت، میری کامیابی، میری کتابیں۔ یہ سب اسی کے صدقہ ہیں۔" اور میں سوچتی ہوں، وہ عورت کتنی خوش قسمت ہوتی ہے، جس کی غیر حاضری میں بھی اس کا خاوند اس کی تعریف کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

ویسے سردارنی کے بارے جب علم ہوا، تو کچھ اس انداز میں کہ موسیٰؑ کا کوہ طور پر

جلنے کا قصہ بھی اس کے سامنے پھیکا پڑ گیا۔

خوشونت کی اور میری دوستی اس وقت ذرا سی زور شور پر آ رہی تھی۔ وہ ابھی دہلی آکر وکیلی کی خواہش اتار رہا تھا۔ مجھے دونوں کسی ڈپلومیٹ کے گھر ڈنر پر مل گئے۔

"اب ذرا فرصت ہے۔ آؤ گھر فرصت کو "سیلی بریٹ" کریں۔"

"کب؟" خوشونت نے مخصوص پیار سے کہا۔

"جب آپ کا دل کرے۔ لیکن دن ابھی طے کرو۔ یہ امرتسری انٹی نیشن نہیں ہے---" میں نے ہنس کر اس کی بات ہی دہرائی۔

"تو--- اس سینچر کو؟"

"بالکل ٹھیک۔ شام کو' جس وقت دل کرے۔ ساتھ سردارنی کو بھی ضرور لانا۔"

کنول قریب ہی بیٹھی تھی' لیکن دیکھ دوسری طرف رہی تھی۔

میں نے کنول کو کہا' "سینچر وار' آپ یاد رکھیں گے کہ صبح فون کرکے یاد کروا دوں؟"

"سینچر؟ وٹ فار؟"

میں کپکپا گئی۔ "یہ ابھی--- یہ ابھی ڈنر کے لئے خوشونت راضی ہوئے ہیں نا۔"

"یہ راضی ہوا ہے' تو جائے' میں تو بالکل نہیں آسکتی۔ ویسے یہ بھی بکواس کر رہا ہے۔ یہ بھی نہیں آسکتا۔ ہماری مالا کی بیٹی ہے' چھوٹی سی' وہ ہمیں شام کو کہیں جانے ہی نہیں دیتی"___ (یہ سب نہایت جنگی آواز میں)۔

مجھے اس طرح کے دھواں دھار واقعات کے ساتھ نپٹنا آتا ہی نہیں۔ اس کے بعد کھانا کھانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' اس لئے میزبان سے چھٹی لے کر گھر آگئی۔

اگلے دن خوشونت میری چوٹوں کو سہلا رہا تھا۔ "سردارنی کی بات کا غصہ؟ تم تو پاگل ہو۔ اگر میں تمہیں اس کی ایک بات سناؤں' تم کہو گی کہ تمہارے ساتھ تو ہوا ہی کچھ نہیں۔"

"ہوں۔" میں نے اپنے آنسو روک کر ہاں کہا۔

"یہ یہ کہ اس دن مانیکا گاندھی اور اس کی ماں آمتیشور آئیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں "سوریا" (اس رسالے کا اجراء مانیکا گاندھی نے کیا تھا) میں مانیکا کی تھوڑی سی مدد کرتا ہوں۔ انہوں نے سوچا کہ پیسے تو لیتا نہیں' اس کو کوئی اچھا سا گفٹ ہی دے

دیں۔ اس لئے ایک پرشین قالین لے کر دونوں آگئیں۔ میں ابھی ان کی اس مہربانی کے نیچے بھیگ ہی رہا تھا کہ سردارنی کمرے میں داخل ہوئی۔ "ہوریبل؟ یہ کہاں سے آئی ہیں؟" ان دونوں نے تو کپکپانا ہی تھا' میں بھی گھبرا گیا۔ کہنے لگی' "یہ رنگ مجھے بالکل پسند نہیں۔ یہ میرے کمرے میں نہیں بچھ سکتا۔ اس کو یہاں سے اٹھاؤ۔" امتیشور نے کہا' "کوئی بات نہیں۔ رنگ تبدیل کرکے آئیں گے۔" "لیکن اس کو تو اٹھاؤ' یہ رنگ۔۔۔" امتیشور' ڈری ہوئی' قالین لپیٹنے لگی۔ "ذرا نوکر کو کہیں' باہر ہماری گاڑی میں رکھ دے۔ میں رنگ تبدیل کرکے۔۔۔" سردارنی گرجی "میرے پاس کوئی نوکر وکر نہیں۔ آپ اٹھا کر باہر رکھو۔" تو یہ ہے میری سردارنی!"۔۔۔ خوشونت ہنس رہا تھا۔ جیسے ماں اپنے شرارتی اور اکلوتے بیٹے کی بات کر رہی ہو۔

(یہ ان دنوں کی بات ہے' جب ملک میں ایمرجنسی تھی' تو سنجے گاندھی اور مانیکا گاندھی کی ایک نظر کے لئے چیف منسٹر بھی گھنٹوں کے گھنٹے انتظار کرتے تھے۔ اور اس نظر کے سیدھے ہونے کا مطلب اور تھا' ترچھی ہونے کا مطلب اور)۔

☆☆☆☆☆

ان برسوں میں خوشونت کے بارے بہت باتیں ہوتی رہیں۔۔۔ کافی ہاؤس میں' دوستوں کی محفلوں میں' اخباروں میں' سیاسی حلقوں میں۔ وہ اندرا گاندھی اور سنجے گاندھی پر فدا تھا۔ سب کہتے تھے' "کیوں نہ ہو جی؟ آخر اندرا گاندھی ہے' شہنشاہ ہے' اور سنجے اس کا پرنس آف ویلز' جانشین' مستقبل کا وزیراعظم۔"

تب ہی راج پلٹا' حکومت تبدیل ہوئی۔ اندرا گاندھی جب گدی سے اتری' لوگ اس کے گھر کی طرف دیکھنے سے بھی ڈرنے لگے۔ اس کے بڑے سے بڑے معتقد بھی یہ بتانے کی کوشش میں مصروف ہو گئے کہ وہ تو محض تماش بین تھے' اور اپنی جان بچانے کے لئے ذرا خاموش تھے' ورنہ۔۔۔

میں خوشونت کے متعلق سوچ رہی تھی' بڑے تجسس سے۔ "اب؟"

تبھی "ویکلی" آئی۔ اس کی تحریروں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہیں ڈگمگایا۔

دوستوں اور قدر دانوں کے دلوں میں اس کے لئے عقیدت بڑھ گئی۔ لیکن "ویکلی" کے مالکوں کو اس کا یہ رویہ پسند نہیں آیا "ویکلی" سے اس کی چھٹی ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

پھر وہ دہلی آ گیا۔ "نیشنل ہیرلڈ" کا ایڈیٹر مقرر ہوا اور کچھ دیر کے بعد وہاں سے بھی رمتے فقیروں کی طرح چلا گیا۔

☆☆☆☆☆

اس وقت وہ "نیو دہلی" کا ایڈیٹر تھا۔ "ارچنا" نے "دنیا کی چترکار عورتوں پر ایک ریسرچ پیس لکھا تھا۔ "نیو دہلی" یعنی خوشونت کو اس نے لکھ کر پوچھا' کہ ان کو چاہیئے؟

جواب آ گیا' شاید تیسرے دن ہی' کہ جلدی بھیج دو۔

ارپنا نے مجھے منع کیا ہوا تھا کہ میں خوشونت کو بالکل نہ بتاؤں' کہ یہ ارپنا میری ہی بیٹی ہے۔ اس لئے میں خاموش رہی۔

آرٹیکل شائع ہو گیا' اور ارپنا تصویریں واپس لینے کے لئے خوشونت کے دفتر گئی۔

خوشونت نے کچھ دیر اس کے ساتھ گپیں لگانے کے بعد' اس کو کہا' "تمہاری شکل تمہاری ماں سے بہت ملتی ہے۔"

یہ ہے خوشونت سنگھ۔ ہماری اس وقت مختصر سی دوستی تھی۔ صرف وہی یہ لفظ میری بیگانی بن کر گئی میری بیٹی کو کہہ سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سردی آخری سانسوں پر تھی۔ دوپہر کے بعد دھوپ منڈیروں سے اترنے لگی تھی۔ ہوا میں حرارت شامل تھی۔ اور زمین سے لے کر آسمان تک جیسے ایک خبر گرم تھی کہ یہ گرمیوں کا آغاز ہے۔

گرمیوں کی جھلسا دینے والی لو کی پیشگوئیوں والی اس سہ پہر میں خبروں سے بھرے دفتر کے ہلکے سانولے غالیچوں میں سے گزر کر خوشونت کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اس وقت وہ "ہندوستان ٹائمز" کا ایڈیٹر تھا۔ مجھے محسوس ہوا' جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں سے گزرتی ہوئی میں بڑی مہارانی مکھی کی خلوت گاہ کی طرف جا رہی ہوں۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ آدھا دروازے کی طرف دیکھتا ہوا' اور آدھا میری طرف دیکھتا ہے' اور ایک بازو والی بے ساختہ ہم آغوشی میں لپیٹ لیتا ہے۔

خوشونت کی ہم آغوشی اس کی مکمل شخصیت کی ترجمانی ہے' مکمل شخصیت کا ذائقہ' جس میں کئی چیزیں شامل ہیں--- اس کی ڈھینگ کہ وہ بے حد عاشق مزاج ہے' اس کی بے انتہا قابلیت' جس نے اس کی طبیعت کو پھولوں جیسا ہلکا کر دیا ہے' اس کی شہرت کو پہاڑوں جیسی بلندی اور ٹھوس پن دیا ہے' اس کا پرانا دبو پن اور بزدلی جو اس کے دیہاتی پس منظر سے چل کر اس کی دادی کے پیار کی محفوظ چار دیواری میں گزارے اس کے بچپن سے وابستہ ہے' اور اس کا خلوص اور اس کی حرارت اور اس کی جھجک اور اس کا بے باک پن۔ ایک عجیب تپاک اور گرم جوشی اور عجیب ہچکچاہٹ۔ اس کے بازو کی بھینچ جیسے ڈر سے کانپتی ہوئی سکڑتی بھی جاتی ہے' ڈھیلی بھی ہوتی جاتی ہے۔

اپنی قلم کے معاملے میں وہ جتنا شیر ہے' ہم آغوشی کے معاملے میں اتنا ہی گیدڑ۔

کہنے لگا' "چلو' آج کہیں بھاگ چلیں۔ یہاں آج بڑے لوگ آرہے ہیں۔ بس' حملہ کر رہے ہیں۔"

اور اس نے جلدی جلدی اپنے کاغذات سمیٹے' اور ہم دفتر سے باہر نکل آئے۔

وہ اس "بھاگ آنے" پر اتنا ہی خوش تھا' جتنا ماسٹر کی مار سے ڈر کر بھاگا اور کھیتوں میں گلی ڈنڈا کھیلتا ہوا لڑکا۔

میں نے کہا' "آپ حملہ کرنے والے لوگوں کے قابو کس طرح آجاتے ہیں؟ باہر پی۔ اے اور کون سا چرخہ کاتتا رہتا ہے؟ ملنے کے شائقینوں کو وہ بھگا نہیں سکتا؟"

کہنے لگا' "وہ تو بھگا ہی دیتا ہے' لیکن کئی دفعہ اس طرح کے لوگ آجاتے ہیں' جن کو بھگایا نہیں جا سکتا۔ جیسے آج صبح رندھاوا صاحب آگئے۔ پی۔ اے کے ساتھ جھگڑ پڑے۔ میں آواز سن کر باہر آیا۔ دیکھا' تو رندھاوا صاحب۔ پی۔اے کی طرف سے معافی مانگی' اندر لے گیا۔ وہ اپنا سارا غصہ اور کنٹیمپٹ نکالنے کے لئے کہنے لگے' "پہلے بتاؤ تمہارا ٹائلٹ کدھر ہے؟"

"خوشونت آپ کے بچے بھی آپ کی طرح ہی ہنستے ہوں گے؟"

"بچوں کی تو یاد نہیں' لیکن میری نواسی---!" اور نواسی کی بات کرتے ہوئے خوشونت کے چہرے پر مجھے نوبیاہتا' لڑکی کی شرمیلی اور پوہ پھٹنے جیسی مسکراہٹ نظر آتی ہے۔

"اس نے تیس کے قریب بلیاں پالی ہوئی ہیں۔ اس نے میری بیوی کے تمام قوانین توڑ دیئے ہیں۔ ہر بلی کے علیحدہ علیحدہ نام رکھے ہوئے ہیں۔ کالو' مینکا گاندھی' چھوٹو سکینہ۔۔ خوشونت ہنستا ہے' پہاڑی نالوں جیسی مسکراہٹ' شفاف' بلوری' چہچہاتی ہنسی۔ یہ چھوٹو سکینہ نام' معلوم ہے' اس کو کس طرح سوجھا ہے!"

نواسی بھی آخر خوشونت سنگھ سردار کی ہے!

☆☆☆☆☆

خوشونت اور میں کناٹ پیلس کے برآمدوں میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔

(یہ انداز ہے خوشونت سنگھ کا۔ چاہے اس کو اپنی خالی شام کے ساتھ پیار آئے' اور چاہے کسی دوست کے ساتھ' وہ اس کے ساتھ رونق والی جگہوں پر چہل قدمی کرتا ہے۔ خالی صبحوں کے ساتھ پیار کرنے کا انداز اس کا اور ہے۔۔۔ لمبی سیر' درختوں اور ہواؤں اور چڑیوں اور کوئلوں کے ساتھ دکھ سکھ کی باتیں)۔

اگلے دن اس کی بیوی کا جنم دن تھا' اور اس نے اس کے لئے کوئی تحفہ خریدنا تھا۔ اس لئے ہم کتابوں کی دکان پر گئے۔ بیوی کے لئے تو اس نے سکھ پینٹنگز والی کتاب خریدی اور اپنے لئے ایراٹک پینٹنگز کی ایک نئی شائع ہوئی کتاب' جس میں اس نے بتایا کہ کانگڑہ اسکول اور بسولی اسکول اور سکھ اسکول کی ایراٹک پینٹنگز ہیں۔ کہنے لگا' "کسی دن ان کی ساری بات فرصت سے تمہیں سمجھاؤں گا۔"

کتابیں خریدنے کے بعد ہم کناٹ پیلس کے برآمدوں میں گھومنے لگے۔

"کناٹ پیلس گھومتے ہوئے آپ کو وہ سب گزرے ہوئے زمانے یاد آتے ہوں گے' جب یہ دہلی کی آکسفورڈ سٹریٹ تعمیر ہو رہی تھی؟"

"بچپن میں جب میں یہاں آیا تھا' تو کناٹ پیلس ہوتا ہی نہیں تھا۔ پہلی دکان پارسیوں کی یہاں کھلی تھی۔ نام تھا' "پیسٹن جی۔" جس جگہ پر اب "وینگر" ہے۔ لیٹنز نے پلین کی تھی یہ کناٹ پیلس بھی۔ زمین یہاں اس وقت دو روپے گز ہوتی تھی۔ اب تو خیر کوئی دو ہزار روپے گز ہو گی!"___ وہ بچوں جیسی معصومیت سے یہ داستان سنا رہا ہے۔

میں ہنستی ہوں۔ اس کی اس معصومیت پر۔ "دو ہزار وپے گز؟" آپ کہاں رہتے ہیں خوشونت؟ یہاں تو بیس ہزار روپے گز بھی ملنی مشکل ہے۔"

"ہیں؟ نہیں!"___ وہ واقعی ٹھٹھک جاتا ہے۔

اس کے اس بھولے پن پر مجھے پیار آتا ہے۔ کناٹ پیلس میں بھی وہ کافی جائیداد کا مالک ہے۔ اس کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس کی شہنشاہیت کی اس وقت کتنی قیمت ہے۔ البتہ چھوٹی باتوں کی' اپنے پرس میں پڑے چالیس پچاس روپوں کی اس کو بہت زیادہ فکر ہوتی ہے۔ مثلاً" ایک دفعہ ہم گیلارڈ میں چائے پینے گئے۔ ایک ایک سینڈوچ کھایا اور چائے کا ایک ایک پیالہ پیا۔ بل آیا اٹھارہ روپے۔ دس دس کے دو نوٹ بیرے کی پلیٹ میں رکھتے وقت اس کو واقعی تکلیف ہو رہی تھی۔ کہنے لگا' "بتاؤ' ایک ایک پیالہ چائے کا پیا ہے' ایک ایک لقمے جتنا سینڈوچ۔ اور اٹھارہ روپے---! ہے نا لوٹ؟"

ایک دن اس نے رام کرشنا سے ایک کتاب خریدی' تین سو کے قریب تھی۔ بل پر اس نے سائن کئے۔ بل میں اس کا خاص ڈسکاؤنٹ بھی کاٹا ہوا تھا۔ پھر بھی اس کو کافی تکلیف ہوئی۔ بتاؤ' اب آدھے مہینے کی میری تنخواہ تو گئی!" وہ ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا' واقعی پریشان تھا۔ پھر اس نے کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھا' "ہیں' یہ آکسفوڑد یونیورسٹی پریس کی ہے؟ لو جی' اور اپنا نقصان کروا لیا۔ وہاں داماد نے مجھے چالیس پچاس روپے اور ڈسکاؤنٹ لے دینا تھا۔

---

کناٹ پیلس کے برآمدے میں گھومتے اس نے جیب میں سے ایک پڑیا نکالی' اور پان منہ میں چبا لیا۔

"کم از کم کسی پڑوسی کو صلح تو مار لیا کریں!" میں نے کہا۔

"یہ تمہیں موافق نہیں آتا تھا۔ میرا خاص پان ہے۔"

کناٹ پیلس کا قصہ پھر شروع ہو گیا۔ اس وقت اس جنگل بیابان میں دو روپے گز زمین خریدنا بھی بڑے جگر کا کام تھا۔ دہلی کا سنٹر دریا گنج ہوا کرتا تھا۔ ماڈرن اسکول بھی پہلے دریا گنج ہی کھلا تھا۔ یہاں' دریا گنج کے اس طرف' کناٹ پیلس وغیرہ سب اجاڑ بیابان تھی۔ کیکر کے درخت اور مویشی چراتے گوجر۔ کناٹ پیلس 1920ء میں بننی شروع ہوئی تھی۔"

کہانی سناتا ہوا وہ مجھے "بابا بوہڑ" معلوم ہو رہا ہے' یا چولہے کے پاس بیٹھی چاندی

کے بالوں والی نانی، جس کے جسم میں سے دودھ کی اور دوپٹے میں سے سبزیوں کی خوشبو آتی ہے۔

"یہ ریگل سینما جب میرے باپ نے بنوایا، تو چلتا ہی نہیں تھا۔ چار پانچ آدمی بیٹھے ہوتے تھے۔ لوگوں کی، دوستوں کی منتیں کرتے تھے کہ فلم دیکھنے آؤ، مفت دکھائیں گے۔ نہ آئیں، تو ان چار پانچ کی منتیں کرتے تھے کہ بھائی گھر جاؤ، فلم کل ہو گی۔"

"جنگل میں ہرن اور مرغابیاں بھی ہوتی ہوں گی!"___ میں پوچھتی ہوں۔

"چھوٹے ہوتے میں بھی یہاں سور اور ہرن مارتا رہا ہوں۔"

"ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ تو چیونٹی نہیں مار سکتے۔"

"نہیں، سچ! ہرنوں کی ڈاروں کی ڈاریں اور چیتے عام نظر آیا کرتے تھے۔ موٹر میں جائیں، تو ہرنوں کی ٹولی کو گزارنے کے لئے کئی دفعہ موٹر روکنی پڑتی تھی۔ جہاں اب راشٹرپتی بھون ہے، یہاں تو بہت ہی گھنا جنگل تھا۔ اجمیری دروازے سے باہر جنگل ہی جنگل تھا۔"

"جنگل میں صرف ہرن اور چیتے ہی ملے، کبھی کوئی شکشلا نہیں ملی؟"

"ارے نہیں۔ اس طرح کی تو بات کرنی بھی منع تھی۔ گھر کا ماحول بڑا "ریجی میشاناں" تھا۔ صبح اٹھ کر پاٹھ کرو، رات کو سوتے وقت پاٹھ کرو۔ پاٹھ پر ہی بہت زور تھا۔ یا صحت بناؤ۔"

"بڑا غیر صحتمندانہ ماحول تھا! مجھے ہمدردی ہے۔"

"یہ جہاں اب چاوڑی بازار اور حوض قاضی ہے، یہ سب "ریڈ لائٹ ایریا تھا۔ کئی دفعہ جھجکتے جھجکتے بازار میں سے گزرتا تھا۔ ڈرتا ڈرتا۔ بتیاں جلا کر کوٹھوں پر بیٹھی ہوتی تھیں۔ گھنگھروں کی اور ناچنے کی اور گانے کی آواز آتی تھی۔"

"کبھی سیڑھیاں بھی چڑھے؟"

"نہیں، ڈر لگتا تھا۔ لیکن بعد میں___" خوشونت ہنستا ہے "بعد میں میرا کنوار پن ایک "پراسٹیچیوٹ" نے ہی توڑا۔"

"یہیں، دہلی میں ہی؟"

"نہیں، بمبئی۔ گاڑی میں بمبئی گیا تھا، اور یو۔ کے، کے لئے جہاز پر سوار ہونا تھا۔ اسٹیشن سے باہر نکلا، تو ایک مل گئی۔ موٹی، بھدی، بدصورت عورت۔ پنجابن تھی۔ مجھے

اس نے پاس بلایا۔ میں چلا گیا مجھے کیا علم تھا! (یہاں ایک نہایت معصوم ادا!) میں تو اس وقت بالکل چھوٹا سا تھا۔ ابھی داڑھی بھی نہیں اگی تھی۔ مجھے وہ ساتھ لے گئی' اپنے کمرے میں۔ ڈر کے مارے میری بری حالت تھی۔"

"اس کے بعد میں ولایت چلا گیا۔ پورا ایک سال وہاں رہا۔ وہاں کچھ ہوا ہی نہیں۔ مجھے تو ڈر ہی لگتا رہتا تھا' اسی لئے میں کسی لڑکی سے بات کرتے شرماتا تھا۔ اور کسی لڑکی نے مجھے خود نہیں ورغلایا۔ اس لئے خشک ہی ایک سال کے بعد واپس آ گیا۔ یہاں دوست چٹخارے لے لے کر پوچھیں۔ اور میں دل سے گڑ گڑ کر مصالحے دار کہانیاں سناتا۔ اندر سے بڑی شرم آئے۔ فیصلہ کیا کہ اب واپس جاکر ساری کسر نکالوں گا۔ اور ایک ماہ کی چھٹی گزار کر جب واپس گیا' تو تمام کسر نکال دی۔"

☆☆☆☆☆

جب خوشونت اپنے بچپن کی بات کرتا ہے' تو مجھے اب بھی وہ بھولا بھالا بچہ لگتا ہے۔ ہڈالی کے ریتلے ٹیلوں میں کھیلتا۔ اونٹوں کی گھنٹیوں کی آوازیں سنتا' اور دادی کے دوپٹے کا کونہ پکڑ کر مکھن اور باسی روٹی کھاتا۔

"میرے بھائی دلجیت کو ابھی تک باسی روٹی اور باسی دال بہت پسند ہے۔ جگر چاہے اس کا کام نہیں کرتا۔ عمر کے ساتھ عادتیں تبدیل کر لینی چاہئیں۔"

عمر کے ساتھ کھانے پینے کی عادتیں چاہے اس نے تبدیل کر لی ہوں' لیکن اس کی روح میں (لیکن وہ تو روح کو تسلیم ہی نہیں کرتا) اس کی طبیعت میں ریتلے ٹیلوں کی وسعت ابھی بھی قائم ہے اور چاندنی راتوں میں چمکتی ریت کا دلکش حسن۔

☆☆☆☆☆

اس دن شام کو وہ اور میں اور میری بٹی ارپنا باتیں کر رہے تھے۔ اس کی سکاچ سے میرے دار جی' یعنی میرے والد صاحب کو کوفت نہ ہو' اس لئے ان کو میں نے اس چھوٹی سی محفل میں نہیں بلایا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ہی تھے۔

خوشونت گھوم پھر کر ارپنا کی نئی پینٹنگز دیکھنے لگا۔ اچانک پچھلے صحن میں نیم اندھیرے میں بیٹھے دار جی' پر اس کی نظر پڑی' اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دار جی کے پاس چلا گیا۔

"ست سری اکال جی۔"

دار جی نے ست سری اکال کا جواب دیا۔

"آپ یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہیں؟"

"ذرا اندر گرمی تھی' یہاں ہوا ہے۔"

"آپ کی بولی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سرگودھا کی طرف سے ہیں۔"
خوشونت مسکرایا' جیسے آنکھ مچولی کھیلتے چھپے ہوئے بچے کو کوئی ڈھونڈ لے۔

"کمال ہیں آپ تو۔ وِیری "ایکسیلنٹ۔" ہاں جی' میں بھیرے کا ہوں۔ سرگودھے میں ہی تھا نا۔"

"مجھے معلوم ہے جی۔ میں تو بھی اسی طرف کا ہوں نا' شاہ پور کا۔"

"خاص شاہ پور؟"

"نہیں' گاؤں ہوتا تھا' ہڈالی۔ شاہ پور کے ضلع میں۔"

"مجھے ہڈالی کا پتہ ہے جی۔ ہمارے نزدیک ہی تھا۔"

اور پل بھر میں دونوں پرانے بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح باتیں کر رہے تھے۔

"آئیں' اندر آجائیں۔"

"نہیں' میں ذرا سا ہوا میں بیٹھوں گا۔ سارا دن' ساری رات پنکھوں کی اور کولروں کی ہوا پھانک کر پریشان ہو جاتا ہوں۔ اس وقت شام کو ذرا سی۔۔۔"

اور خوشونت سنگھ اسی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا شام کی سرمئی نیم خوابیدہ ہوا کی طرح چلتا ہوا' دوسرے کمرے میں جاکر ارپنا کی پینٹنگز دیکھنے لگا۔

دار جی نے مجھے پوچھا' "یہ کون تھا؟"

مجھے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔ میں نے انٹرڈیوس ہی نہیں کرایا تھا۔ میں نے کہا' "یہ خوشونت سنگھ تھا۔"

"ہیں؟ خوشونت سنگھ؟ "وہ" خوشونت سنگھ؟"

"ہاں' وہی۔"

اور دار جی کو حیران بیٹھا چھوڑ کر اندر خوشونت کے پاس آگئی۔

---

میں سوچ رہی تھی' خوشونت کو مل کر ہر کوئی اسی طرح حیران ہوتا ہو گا۔ اس کے بارے سن کر' پڑھ کر' یا اس کی لکھی کتابیں پڑھ کر جو اس کا "امیج" بنتا ہے' بہت ہی

بھاری بھر کم سا' "انفلیٹڈ گر-ٹنیس" کا' اس کو مل کر لگتا ہے' "ارے' یہ ہے خوشونت سنگھ؟ "وہ خوشونت سنگھ؟" یہ تو بہت ہی پیارا انسان ہے۔ یہ وہی خوشونت سنگھ ہے؟--- جس کا والد آدھی دہلی کا مالک تھا' اور اب اس کا چوتھا حصہ مالک خوشونت آپ ہے۔ جس نے ڈھیروں کے ڈھیر کتابیں لکھی ہیں۔ جو ملک کی حکومت کو چلانے والی پارلیمنٹ کا اہم حصہ ہے اور جس کا وزیراعظم اندرا گاندھی کے ساتھ اور سنجے گاندھی کے ساتھ اور مانیکا گاندھی کے ساتھ بالکل گھریلو قسم کا رشتہ ہے۔ جو ہندوستان کے بڑے اخبار "ہندوستان ٹائمز" کا ایڈیٹر ہے۔"

اس کو مل کر گرمیوں کے موسم میں ٹھنڈے پانی میں نہانے جیسا لطف ملتا ہے۔

☆☆☆☆☆

دارجی کے ساتھ باتیں کرتے وہ اپنے گاؤں ہڈالی پہنچ گیا تھا۔ واپس کمرے میں آکر بھی وہ ہڈالی میں ہی گھومتا رہا۔

"جہلم سے تقریباً" تیس میل دور یہ ہمارا ہڈالی گاؤں تھا۔ خوشاب اور مٹھہ ٹوانہ کے درمیان۔"

"اوتار کب حضور نے دھارا تھا؟"

"کاغذات میں تو فروری کا مہینہ لکھا ہے۔ دو تاریخ۔ لیکن دادی کہتی تھی' میں بھادوں کے ماہ پیدا ہوا تھا۔ برساتیں ختم ہی ہوئی تھیں۔ اس لئے میرا اندازہ ہے' شاید اگست ہو گا۔"

"بچپن ہڈالی میں ہی گزرا؟"

"ہاں' میرے دادا یہاں آگئے تھے دہلی۔ سبحان سنگھ۔ وہاں بھی وہ کافی مشہور شخص تھے۔ ان کے نام کا ریلوے اسٹیشن بنا تھا' "کوٹ سبحان سنگھ۔" اس دن پاکستان کے سفیر عبدالستار کی بیگم کہہ رہی تھیں کہ اسٹیشن کا نام ابھی بھی وہی ہے۔ وہاں میرے دادے کو بے شمار زمینیں ملی ہوئی تھیں۔ تقریباً" دو ڈھائی سو مربعے۔ منٹگمری اور خانیوال کے درمیان' میاں چنوں۔ دراصل ہمارے علاقے کے لوگ کافی جاذب نظر تھے--- تگڑی کاٹھیاں' مضبوط جسم' اونچے لمبے قد آور۔ ان لوگوں میں بلوچستان اور پنجاب کا خون شامل تھا۔ محنتی اور ایماندار۔ وائسرائے کے آدھے باڈی گارڈز میرے گاؤں سے ہی بھرتی ہوتے تھے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میرے دادے نے بڑے

رنگروٹ اس علاقے سے بھرتی کروائے تھے۔ انگریز حکمران خوش تھے۔ خدمت کے عوض میں انہوں نے بے شمار جاگیریں میرے دادے کو دے چھوڑی تھیں۔ زمینیں نہری' علاقوں میں تھیں' سونا اگلتی تھیں۔ ان پیسوں سے دادا جی کارخانے بنواتے گئے! سارے غریب اور بے ایمان رشتے داروں کو انہوں نے کارخانوں میں کام پر لگا دیا۔ ان کے بیٹے تو دو ہی تھے' میرے والد صاحب اور ایک ان کا بڑا بھائی' اجل سنگھ' جو مدراس کے گورنر۔۔۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ان کے ساتھ دار جی کی کافی دوستی تھی۔ 1947ء میں جان ہتھیلی پر رکھ کر وہ دار جی کی دوستی کی خاطر امرتسر سے لاہور ان کے ساتھ گئے تھے۔"

"خیر دوستی کی خاطر جان ہتھیلی پر رکھنے والے تو وہ ہی نہیں تھے' لیکن۔۔۔"

"وہ موسم ہی عجیب تھا۔ انہونے واقعات ہوتے تھے۔ مائیں بیٹوں کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھیں' اور کئی بالکل روکھے لوگ دوسروں کی خاطر جانیں نثار کر رہے تھے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" خوشونت کو شاید اپنی کتاب "ٹرین ٹو پاکستان" یاد آ رہی تھی۔

"اچھا' آپ ان زمینوں اور کارخانوں کی بات بتائیں۔"

"ایک دفعہ میں نے کہیں لکھ دیا کہ میرے دادا پڑدادا وہاں شاہ پور میں بیاج پر روپیہ دینے کا دھندہ کرتے تھے۔ وہ میرے ساتھ بہت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے' زمینیں ملنے سے پہلے وہ بیوپاری تھے۔ اونٹوں پر کھیوڑہ سے نمک لاد کر امرتسر لے جاتے تھے اور امرتسر سے تیل' ماچسیں' موم بتیاں' کپڑا اور دوسرا ساز و سامان گاؤں لے آتے تھے۔ بعد میں زمینداریوں' کارخانے داریوں اور ٹھیکیداریوں میں پڑ گئے۔"

"لیکن آپ کو کیوں نہ زمینداریاں' نہ کارخانے داریاں اور نہ ٹھیکیداریاں راس آئیں؟ آپ کیوں اس الٹے رستے پر چل پڑے؟"

"میں سال بھر کا تھا' کہ دادے کے پیچھے پیچھے میرے والد اور بڑا بھائی بھی دہلی آ گئے۔ میں وہاں دادی کے پاس اکیلا رہ گیا۔ چار پانچ سال وہیں رہا۔ دادی ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی اور پاٹھ کرتی رہتی تھی۔ گاؤں میں تمام گھر تقریباً" مسلمانوں کے ہی تھے۔ صرف چار پانچ گھر ہندوؤں سکھوں کے تھے۔ گاؤں میں اسکول کوئی نہیں تھا۔ چھوٹے ہوتے دادی نے پانچ جماعتیں پڑھائیں اور پاٹھ کرنا سکھا دیا' اور جب تین سال کا تھا تو گاؤں کی دھرم شالہ میں پڑھنے کے لئے داخل کروا دیا۔"

"آج کوئی دیکھے گاؤں کی دھرم شالہ میں پڑھے ہوئے اس لڑکے کو؟"
خوشونت ہنستا ہے۔
"اور لندن بھی پڑھنے کے لئے گئے تھے؟"
"وکالت۔"
"وکالت؟" میں بے حد حیران ہوتی ہوں۔
میں نے بار ایٹ لاء کیا ہوا ہے۔ پھر لاہور سات سال پریکٹس بھی کی تھی۔ شاید میں ساری عمر ہی وکیل بنا رہتا' اور ابھی تک سیاہ کوٹ میرے کندھوں پر ہینگر کی طرح جھولتا لٹکا ہوتا۔ نہیں' اب تک میں کافی عرصہ پہلے سپریم کورٹ کا جج بن گیا ہوتا تھا۔ بہت عرصہ پہلے میرے ساتھی بن گئے۔ لیکن ملک کی تقسیم ہو گئی' اور میں دہلی آگیا۔
"دہلی آکر وکالت نہیں کی؟"
"نہیں۔ شکر کیا' وکالت سے چھٹی ہو گئی۔ یہ مجھے لاہور بھی محسوس ہوتا تھا کہ میں وکالت کرنے کے لئے پیدا نہیں ہوا۔ بس' فارن سروس کے لئے اپلائی کیا' اور فوراً منتخب ہو گیا۔ یہاں سے لندن' پھر کینیڈا۔"
"پہلی چیز کب لکھی؟"
"کینیڈا میں۔ افسانہ "مارک آف وشنو"۔ "ہارپرز" میگزین میں شائع ہوا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا' کہ میری لکھی چیز ملک کے بہترین ادبی میگزین میں شائع ہو سکتی ہے۔ بس' پھر لکھتا گیا۔ 1950ء میں پہلی کولیکشن شائع ہوئی' اس کہانی کی نام پر۔ بڑے اچھے ریویو آئے۔ کنول دونوں بچوں کو لے کر ہندوستان چھٹیاں گزارنے کے لئے آئی' اور میں نے اسی دن استعفیٰ دے دیا۔ چھ ماہ کا مکان کا کرایہ دیا ہوا تھا۔ بس اور کس بات کی پرواہ تھی؟ ریزائن کرکے میں نے دن رات لکھنا شروع کر دیا۔ "فرسٹ شاٹ ہسٹری آف دی سکھ" لکھی' اور یہاں ہی "ایلن اینڈ اینوین" نے شائع کرنے کے لئے لی۔ "ٹرین ٹو پاکستان" کا بھی ڈرافٹ لندن میں ہی مکمل کیا۔ ختم یہاں آکر کی۔ "جپ جی" کا ترجمہ وہاں ہی کیا اور وہاں ہی شائع ہو گیا۔"
"کام ہی کرتے رہے؟ خرافات کوئی نہیں کی؟ خاص طور پر جب "ٹمپریری بیچلر" تھے!"
"یہ "اکی" ہے نا' اقبال سنگھ' یہ ان دنوں میرے پاس رہ رہا تھا۔ بس' لڑکی مجھ

سے ملنے کے لئے آتی تھی' عشق یہ مار لیتا تھا۔" خوشونت ہنستا ہے۔

"واپس آیا۔ والد ناراض۔ بیوی ناراض۔ دوست رشتے دار ناراض۔ کہنے لگے' بڑا ناڈو خاں! امتحان تو مر مر کر پاس کرتا تھا' اب یہ کتابیں لکھے گا! بیوی دوستوں کو کہے نکما ہے' آپ سمجھائیں' میں اب بے چاری کیا کروں! میں تنگ آکر بھوپال چلا گیا۔ وہاں ہماری ایک فیکٹری ہوتی تھی۔ وہاں جاکر لکھتا رہا۔ نوکر کو ساتھ لے کر رسولی چلا گیا۔ لکھتا رہا۔ "ٹرین ٹو پاکستان" مکمل کی۔ امریکہ کا "گلوب پریس" ایوارڈ مل گیا۔ دیس پردیس میں بہت زیادہ چرچا ہوا' تعریف ہوئی۔ تمام دنیا کی زبانوں میں تراجم شائع ہوئے۔ ایک دن ایک انگریز نے میرے والد کو کہا' "آر یو دی فادر آف خوشونت سنگھ؟ آئی وڈ لائق ٹو میٹ ہم۔" سب نے سمجھا کہ کوئی بات تو شاید ہے۔ میں گھر میں مشہور ہو گیا۔"

"تو نظر ثانی کے تحت رہتے مجرم کو "آل کلیئر" کی راہداری کا ٹھپہ مل گیا!"

"ہاں' سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ مجھے بیوی نے بھی منظور کر لیا۔ پھر یونیسکو کی ملازمت پیرس میں ملی۔ دو سال کے بعد ہی زور سے دور پھینک دی۔ "یوجنا" کی ایڈیٹری کی۔ ریڈیو میں بھی دو سال آوارہ گردی کی۔"

"آوارہ گردی؟ یعنی؟"

"اور کیا؟ ریڈیو میں کام کون کرتا ہے؟ پھر امریکہ' آکسفورڈ' ٹوکیو پڑھاتا بھی رہا۔"

"ساتھ ساتھ لکھتے بھی رہے؟"

"وہ تو باقاعدہ۔ صبح تین بجے اٹھ پڑتا تھا۔ ان دنوں "ہسٹری آف دی سکھ" لکھ رہا تھا۔ صبح تین بجے اٹھ کر ایک شبد لے کر بیٹھ جاتا تھا' بریک فاسٹ تک ترجمہ مکمل کر لیتا تھا۔ دل میں اتنا شوق رہتا تھا کہ واقعی محسوس ہوتا تھا کہ گورو نے میرے کندھوں پر ہاتھ رکھا ہوا ہے۔ کئی کچھ ترجمہ کیا۔۔۔ "آسا کی وار" "بارہ ماہ" "جپ جی" "دسم گرنتھ" کے بہت سارے حصے۔ تین سال کے لئے راک فورڈ گرانٹ مل گئی تھی' "ہسٹری آف دی سکھ" کے لئے' اور ایک سال میں علی گڑھ یونیورسٹی سے گرانٹ یہ کام مکمل کرنے کے واسطے۔ دونوں حصے مکمل کرکے آخر میں میں نے لیٹن کے یہ دو لفظ لکھے' "اوپس ایکسیرہی" یعنی میری زندگی کا کام مکمل ہو گیا۔"

"آج کل کیا کر رہے ہیں؟"

''اقبال کا ترجمہ کر رہا ہوں۔''

''وہ مجھے معلوم ہے۔ اس دن' اس جرمن خاتون' پروفیسرانی میری شمل سے' جو فارسی کی سکالر تھی' پوچھ تو رہے تھے' ''ملت بیضا'' کا مطلب کیا ہے؟''

''ہاں' جس چیز کے بارے مجھے ذرا سا بھی شک ہو' وہ میں ہر ایرے غیرے سے پوچھتا رہتا ہوں' جب تک مجھے یقین نہ ہو جائے۔''

''مجھے یاد ہے' جب آپ اس پروفیسر کو کسی ہربنس سنگھ کے بارے بتا رہے تھے' سٹوئک' سالڈ' ڈل' گڈ' آئی فرائنڈ ہم آنرئیڈیبل۔''

''تمہیں یاد ہے؟''

ہم دونوں ہنستے ہیں۔

''کہانی' ناول' گوروبانی کے تراجم' سکھوں کی تاریخ' رنجیت سنگھ' اقبال۔۔۔''

''امراؤ جان ادا'' ترجمہ کی ہے۔ ذاکر حسین کے بارے ایک کتاب راجندر سنگھ بیدی کی' ''ایک چادر میلی سی'' اور امرتا پریم کا ''پنجر''۔ سب کا ترجمہ انگریزی میں کیا ہے' اور بہت کچھ۔''

''اور کیا لکھنے کو دل کرتا ہے؟''

''ایک دہلی کے بارے تواریخی ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ پرتھوی راج چوہان سے لے کر گاندھی کے قتل تک۔''

''تواریخ تو اس دہلی میں روز گڑی جاتی ہے اور یہ دہلی سارے ملک کی تواریخ گڑتی ہے۔ شروع کر دیں' اور لکھتے جائیں۔ صرف گاندھی کے قتل تک ہی کیوں؟ جہاں تک ساتھ ساتھ چلتے جائیں' لکھتے جائیں۔ یہ تاریخ لکھ بھی صرف ایک ہی شخص سکتا ہے۔۔۔ خوشونت سنگھ۔''

''وہ تو ہے''۔۔۔ وہ بچوں جیسی معصومیت اور سنجیدہ ایمانداری کے ساتھ کہتا ہے۔

☆☆☆☆☆

''خوشونت' مجھے لگتا ہے' ساری زندگی میں آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہو گی' جس کو کرنے سے بعد میں کوفت ہو' یا شرمندگی ہو۔''

وہ سوچنے لگا۔ اپنے گزرے زمانے میں جھانک کر جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو کہنے لگا'

"شرمندگی؟ شاید نہیں۔ میں نے ایسی شاید کبھی کوئی بات نہیں کی، جس سے مجھے کسی اور کے آگے شرمندہ ہونا پڑے۔ لیکن اپنے آپ کے آگے--- ہاں، شاید--- ایک آدھ دفعہ---"

"شیخی والی باتیں تو سب ہی بتا دیتے ہیں، لیکن شرمندگی والی بات بتانے کے لئے خوشونت سنگھ کا جگر چاہئے۔" میں نے جیسے اس کو شہہ دی۔

وہ سنجیدہ ہو گیا۔ نیویارک میں میری ایک دوست ہے، بڑے سالوں سے۔ جب بھی میں وہاں جاتا ہوں، اس سے ضرور ملتا ہوں۔"

"مسٹریس ہے؟"___ میں مسکرائی۔

"نہیں، دوست ہے۔" وہ تو واقعی بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ "جب میں نے اس سے پہلے پہل ملنا شروع کیا، اس کی ایک چھوٹی سی بیٹی تھی، بالکل گڑیا جیسی۔ گود میں اٹھا کر میں اس کو کھلایا کرتا تھا۔"

"آہستہ آہستہ وہ بڑی ہوتی گئی، لیکن میں نے توجہ نہ دی۔ ہر سال چھ ماہ کے بعد جب میں جاتا، وہ مجھے اسی طرح بچی جیسی لگتی۔"

"گزشتہ برس میں گیا۔ اپنی دوست کے ساتھ اس کے گھر ہی بیٹھا تھا، کہ فون آیا۔ اس کی بچی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور وہ ہسپتال پہنچائی جا رہی تھی۔ اس نے ماں کو ہسپتال پہنچنے کے لئے کہا تھا۔

"وہ بے حد گھبرا گئی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا، ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھنڈا پسینہ تھا، اور وہ کانپ رہی تھی۔ میں نے کہا، فکر نہ کرو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔"

"آپا دھاپی میں ہم ہسپتال پہنچے۔ معلوم ہوا اس کے زخموں کو دھو پونچھ کر مرہم پٹی کی جا رہی ہے۔ ہم فرسٹ ایڈ والے کمرے میں پہنچے۔ وہاں میز پر وہ لیٹی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کے سارے کپڑے اتار رکھے تھے۔ چوٹ زیادہ نہیں لگی تھی۔ وہ زیادہ گھبرا گئی تھی۔ چوٹ کم تھی، چوٹ کا شاک زیادہ تھا۔"

"سانس میں سانس آیا۔ فکر کم ہو گیا، اور پھر میں اس کو دیکھنے لگ گیا۔ پہلی دفعہ مجھے احساس ہوا کہ لڑکی تو جوان ہو گئی تھی۔ میدے میں کیسر گھول کر گوندھا گیا اچھوتا جسم! سفید، گلابی، شبنم سے بھیگی، نازک، فلالیس۔ اس کا بدن جیسے خدا کا کرشمہ تھا۔ مجسم حسن! طلسم!

"اور میرے بدن میں ایک پاگل چاہت سرکتی ہوئی رینگنے لگی۔
"اور خدایا' یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کس طرح کے خیال آرہے تھے!
"بعد میں مجھے لگا کہ یہ بہت غلیظ حرکت تھی۔ میں اس کا بوجھ اکیلا نہیں اٹھا سکتا تھا' اس لئے میں نے اپنی دوست کو بتا دیا۔ گناہ کا اقبال کر کے میں ذرا ہلکا ہو گیا۔ لیکن۔۔۔"

☆☆☆☆☆

"اچھا' چھوڑیں یہ گناہ گاریوں کی شرمساریوں کی باتیں۔ کوئی ایسی بات سنائیں' جس پر آپ نے فخر کیا ہو؟"
"وہ تو میری رائٹنگ ہی ہے۔ یا۔۔۔ جب میں کنول کو جیت کر اس کے ساتھ شادی کروائی تھی۔ یا میری نواسی۔۔۔"
"وہ تو ہے ہی۔۔۔!"
"ایک واقعہ ہے۔ اس کو جب بھی میں یاد کرتا ہوں' مجھے اپنے آپ پر فخر ہوتا ہے کہ میرے جیسا بزدل شخص کس طرح اتنی جرات کر سکتا ہے؟"
"اس دن میں فارن سروس کے لئے انٹرویو دے کر آیا تھا۔ ملک کی تقسیم کے وقت کی بات ہے۔ میں لاہور سے دہلی آگیا تھا۔ بڑے ظالم دن تھے' مار دھاڑ' قتل و غارت۔ میں تیس ہزاری کے پاس سے گزر رہا تھا' کہ ایک جگہ لوگوں کا ہجوم نظر آیا۔ نزدیک جاکر دیکھا' تو ہجوم میں گھرے ہوئے دو مسلمان نظر آئے' جنہوں نے ایک گائے کا رسہ پکڑا ہوا تھا۔ ساتھ ایک سردار بھی تھا' جس کی پگڑی ڈھلک کر اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی۔ ہجوم کے لوگ اس سکھ کو بھی مار رہے تھے' اور دونوں مسلمانوں کو بھی۔ معلوم ہوا کہ اس سکھ نے شاید وہ گائے مسلمانوں کو فروخت کی تھی۔ سکھ کہہ رہا تھا کہ مسلمانوں نے یوں ہی اپنے آپ کو بچانے کی خاطر اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کا نام لے دیا تھا۔
"میں یوں تو اس طرح کے ہجوم کو دیکھ کر راستہ بدل کر گزر جاتا ہوں' لیکن اس دن معلوم نہیں کیا ہوا' میں آگے بڑھا اور اس سکھ کو ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔ مسلمانوں کو بھی دو چار دھکے مار کر بھگا دینا چاہتا تھا' لیکن ہجوم نہ مانا۔ وہ تو ان کو مار دینے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے ان کو کہا' "کیوں ان کو مار کر قانون کے ساتھ ٹکراتے ہو؟ میں ان کو

تھانے لے چلتا ہوں۔" لوگ مان نہیں رہے تھے۔ خیر' میں نے رعب ڈالا' کہ میں سرکاری آدمی ہوں۔ جھوٹ نہیں تھا' گھنٹہ بھر پہلے ہی میرا انٹرویو ہوا تھا اور میں منتخب ہو گیا تھا۔ سرکاری آدمی تو ہو ہی گیا تھا' لیکن مانے کون؟ ایک تو ہجوم کا غصہ' اور دوسرے زمانہ خونریز تھا۔

"خیر بڑی مشکل کے ساتھ آدھ پون گھنٹے کے بعد میں نے گائے کا رسہ خود پکڑ لیا اور دونوں کو تھانے کی طرف لے کر چل دیا۔"

"تھانیدار نے رپورٹ لکھنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگا' کسی نے گائے فروخت کی ہے' اور کسی نے خریدی ہے' اس میں قانون کیوں دخل دے؟ اس کو سمجھایا' کہ میرا مطلب تو یہ تھا کہ وہ ان دونوں مسلمانوں کو حراست میں لے لے' تاکہ وہ ہجوم کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچ جائیں۔ لیکن وہ ان کو بچانا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھی شاید پنجاب سے اجڑ کر آیا ہو گا۔

"خیر' میں ان کو دوسرے تھانے لے گیا۔ آگے آگے گائے کا رسہ پکڑ کر میں' پیچھے وہ دونوں مسلمان۔ وہاں بھی وہی ہوا۔ لیکن اس وقت یہ ہجوم دو چار سو لوگوں میں سے بمشکل دس پندرہ کا ہی ساتھ رہ گیا۔ تھکے ہارے' اور اب تک غصہ نچوڑنے کے بعد مروڑ کر سکھانے کے لئے ڈالے گئے' کپڑوں کی طرح وہ دس پندرہ لوگ۔ گائے کا رسہ چھوڑ کر اس کو میں نے دو تین دھکے دیئے اور وہ بھاگ گئی۔

"ان لوگوں کو بھی میں نے سمجھا بجھا کر روانہ کر دیا۔ کہا' ان مسلمانوں کو میں اپنے گھر لے جاتا ہوں' وہاں پچھواڑے ان کا صفایا کروا دوں گا۔

"ٹیکسی لے کر ان دونوں کو میں نے اپنے ساتھ بٹھا لیا اور چل پڑا۔ دریا گنج پہنچ کر ٹیکسی رکوائی' اور ان کو کہا "جاؤ' بھاگ جاؤ' اپنے گھروں کو۔"

"جس وقت ان کو یقین آ گیا کہ وہ بالکل بچ گئے تھے اور محفوظ تھے' کہنے لگے' لیکن سردار جی گائے بھاگ گئی' یہ بہت غلط بات ہوئی۔"

"ٹیکسی میں سے اترنے کے بعد' مجھے پختہ یقین ہے کہ وہ گائے کو تلاش کرنے کے لئے گئے ہوں گے۔"

☆☆☆☆☆

ایک دن میں خوشونت سنگھ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کے سیکرٹری نے آکر کہا' "

تقریباً" چالیس جرنلزم کے سٹوڈنٹ بڑودہ سے آئے ہیں۔ چار پانچ منٹ کے لئے ملنا چاہتے ہیں۔"

ایسے وقت میں خوشونت بڑے تذبذب میں پڑ جاتا ہے۔ خیر ان کو بلا لیا۔

تقریباً" آدھے لڑکے تھے' آدھی لڑکیاں۔ پانچ چھ منٹ تو کرسیوں کا انتظام کرنے میں ہی لگ گئے۔ پھر پون گھنٹہ وہ سب سے باتیں کرتا رہا۔

ایک لڑکی نے پوچھا' "آپ جرنلزم میں کس طرح آگئے؟"

خوشونت ہنسا' "آپ کی طرح میں نے جرنلزم کی ٹریننگ نہیں لی۔ پہلے وکالت کی' کامیاب نہ ہوا۔ پھر ڈپلومیٹ بنا۔ فٹیچر! پھر پروفیسری کی' وہ بھی چھوڑ کر بھاگ آیا۔ پھر جرنلسٹ بن گیا۔ اس میں جم گیا۔"

اخبار کی پالیسی بارے باتیں ہوتی رہیں۔ پالٹکس بارے' پارلیمنٹ بارے' سنجے اور مانیکا بارے' اندرا گاندھی بارے۔

"یہاں کوئی بھی ایوننگ نیوز کیوں کامیاب نہیں ہوا؟" ایک لڑکے نے پوچھا۔

"کیونکہ ٹیلی پرنٹر تو دوپہر کو چلنے شروع ہوتے ہیں' خبریں شام کے وقت تیار ہوتی ہیں۔ ایوننگ نیوز اس وقت شائع ہو کر فروخت بھی ہو رہا ہوتا ہے۔ صرف دہلی ہی میں نہیں' بمبئی میں بھی یہی حال ہے۔ جرنلسٹ صبح سویرے میری طرح کام کرنا شروع نہیں کرتے۔ شام کا اخبار کیا تیار ہوا۔ اخبار تو صرف رات کو ہی تیار ہوتا ہے اور صبح تقسیم ہوتا ہے۔ وہی اصلی اخبار ہے۔"

"اسی لئے مسز اندرا گاندھی اپنے سارے فیصلے آدھی رات کو ہی کرتی ہیں؟"

سارے ہنستے۔ خوشونت بھی۔ کہنے لگے' "مجھے بھی یہی شک ہے' اور کئی دفعہ میں خود بھی سوچتا ہوں کہ اپنے مرنے کا وقت بھی ذرا سوچ سمجھ کر آدھی رات کے قریب قریب ہی طے کروں گا' تاکہ ذرا رعب سے خبر شائع ہو سکے۔"

خوشونت کے قہقہے کے ساتھ سارے ہنس پڑے۔

میں اداس ہو جاتی ہوں۔

اجیت کور: 1981ء _____

KHUSHWANT SINGH
86
NOT OUT
Sex
Scotch
Scholarship
Wit
Humour
'Malice
Porn
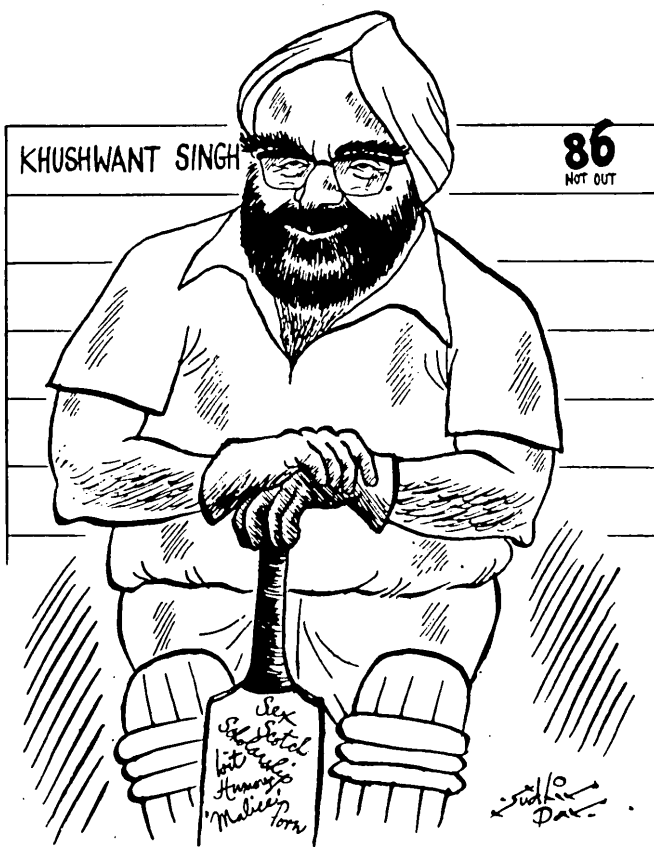
# دیباچہ

خوشونت سنگھ کو ملک کا کون سا پڑھا لکھا شخص نہیں جانتا۔ انگریزی' ہندی اور مختلف علاقائی زبانوں کے تقریباً" پچاس اخباروں' رسالوں میں ان کے ہفتہ وار کالم باقاعدہ صورت سے شائع ہوتے ہیں۔ ملک میں ہی نہیں' غیر ممالک کے بھی مشہور اخباروں' رسالوں میں شائع ان کے ہنگامی مضامین کو خاص تجسّس اور شوق کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

موضوع کی انفرادیت اور انداز کی دلچسپی ان کی تحریر کی خاصیت ہے۔ اپنے ملک اور اپنے لوگوں کو تہہ دل سے پیار کرتے ہوئے بھی وہ ان کی خامیوں' نقائص اور دقیانوسی طرز فکر پر وار کرنے سے ذرا بھی نہیں کتراتے۔ ہنگامی واقعات کی مفصل اور صحیح معلومات' تاریخ کا خصوصی علم' ملک اور غیر ممالک کے تفصیلی دورے اور اپنے آپ کو ناستک کہتے ہوئے بھی دنیا کے اہم مذاہب اور اندھے اعتقاد کے بارے گہرا مطالعہ و مشاہدہ جیسی خوبیوں نے ان کی تحریروں کو دلچسپی کے ساتھ ساتھ مستند و مسلم ثابت کیا ہے۔

قارئین طبقے میں خوشونت سنگھ کی اپنی ایک الگ ہی پہچان ہے' امیج ہے۔ وہ انگریزی ادبی دنیا کے سب سے زیادہ مذکور اور متنازعہ شخصیت ہیں۔

اپنی حال ہی میں شائع کتاب "میلیش ئیش گوسپ" میں وہ اپنے بارے لکھتے ہیں' "آئی ایم ناٹ اے نائس مین ٹو نو!" (بے شک مذاق میں ہی)۔ لیکن یہ کہتے ہوئے ذرا بھی تذبذب نہیں ہوتا کہ ان جیسے ہمدرد' صاف دل' حساس اور جذباتی لوگ کم ہی

دیکھے جا سکتے ہیں۔ انگریزی میں کہیں، تو صحیح معنوں میں ایک "تھورو جنٹلمین" ہیں۔

---

اخبار نویسی سے وابستہ رہ کر بھی خوشونت سنگھ نے انگریزی میں لکھنے والے ایک بھارتی افسانہ نویس کی صورت میں اپنی خاص شناخت بنا رکھی ہے۔

اس مجموعے میں ان کے کچھ نمائندہ افسانے شامل ہیں، جنہیں ان کے تین افسانوی مجموعوں میں سے منتخب کیا گیا ہے۔ خوشونت سنگھ کے افسانوں کی دنیا نہ تو محدود ہے اور نہ ہی ان میں یکسانیت ہے، اس لئے یہ افسانے اپنی خاص انفرادیت کے لئے خاص طور سے قابل تحریر ہیں۔ غور سے پڑھنے پر ان کی دنیا، جہاں ہماری سماجی دنیا کی کئی خصوصیات کو اجاگر کرتی ہے، وہیں ان میں ادیب کی اپنی شخصیت کی بھی نمائندگی ہوتی ہے--- قابل غور اور قابل احساس انداز بیاں سادہ، آسان اور زبان میں روانی ہے۔ زندگی کے وسیع تجربات احساسات میں پروان چڑھے ان افسانوں میں ہمارے ملک کی سوندھی خوشبو ہے۔ انسانی زندگی میں گہری جڑ جمائے ہوئے اصولوں، معیاروں اور دقیانوسی روایات پر سخت وار کرتے ہوئے یہ چٹیلے افسانے اپنے وقت کی زندہ بازگشت ہیں، جو اگر ہمیں گدگداتے ہیں، تو سوچنے سمجھنے کے لئے راغب بھی کرتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ ایک ایسے ایشیائی ادیب کے افسانے بھی ہیں، جو اپنے منہ پھٹ مزاج اور آزادانہ خیالات کے لئے بہت بار تنازعہ اور مخاصمت کے گھیرے میں بھی رہا ہے۔

---

اس مجموعے کے افسانوں کو پڑھنا ایک کشادہ اور امیر دل دوست کے ساتھ جیسا ہے، جو لمبے چوڑے گھاس کے لانوں، ٹیلی فونوں، موٹروں والی کوٹھیوں میں لے جاتا ہے۔ (جب دولت رام مرا) بڑی بڑی دعوتوں میں ہر رنگ کے شہریوں کے ساتھ ملاتا ہے۔ (بیمے کا ایجنٹ) فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں انگریز ساتھیوں کے ساتھ سفر کرواتا ہے۔ (عملوں کا پھل) مارتھا جیسی حبشن کے ساتھ ملاقات کراتا ہے (کالی چمیلی) ڈاک بنگلوں میں ٹھہراتا ہے، جن کے گرد وقت نے افسانوں کے گھنے جال بن رکھے ہیں (مانڈلے کی میم) کیا یہ اردو افسانے کے لئے نئے مضامین نہیں؟

یہ افسانے پڑھتے پڑھتے مجھے سردار خوشونت سنگھ کے لاہور والے گھر کی یاد آتی رہتی ہے۔ کھلے، وسیع بڑے بڑے کمرے اور خوبصورتی سے سجائے ہوئے۔ اچھی سے

اچھی کتابیں' نئے سے نئے رسالے' سیانے سے سیانے' پڑھے لکھے پروفیسر' آرٹسٹ دوست' سردارنی خوشونت سنگھ کا خالص پنجابی لباس' پنجابی کے' انگریزی کے سٹڈی سرکل' لیٹ نائٹ پارٹیاں' بھائی سدھ سنگھ پر دھان سنگھ کا کیرتن' اکھنڈ پاٹھ--- ہر چیز کی بہتات۔ جدید اور اپنے پرانے کلچر کا ایک امتزاج۔

اور یہ امتزاج قارئین کو ان افسانوں میں ملے گا۔ یہ افسانے اس دادی کے مرنے سے پہلے کے وقت کے ہیں' جو چڑیوں کو دانہ ڈالتی ہے' چرخہ چلاتی ہے' چوبیس گھنٹے ذکر میں جس کے ہونٹ ہلتے رہتے ہیں اور جس کا لاڈلا پوتا پانچ سال پڑھنے کے لئے ولایت جاتا ہے۔ ان افسانوں میں سانپوں کو دودھ پلانے والا توہمات کے بوجھ تلے دبا مالی' ہاکیاں اٹھائے' بیڈ منٹن کے ریکٹ اٹھائے' سائنس پڑھنے والے انگریزی سکول کے بچوں میں بھٹکتا دکھائی دیتا ہے' جس کو لینے آیا موت کا فرشتہ اس کا اپنا باپ ہوتا ہے اور جس کو' اس کا نئے زمانے کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر روزانہ کافی پینے والا بیٹا اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ان افسانوں میں پانوں کی شوقین' آم کے آچار سے روٹی کھانے والی بوڑھی پھپھی ہے' جس کا خاوند سرموہن لال فرسٹ کلاس کے ڈبوں میں سفر کرکے خوش ہوتا ہے۔ اس طرح نیا پن پرانے پن سے ٹکراتا ہمیں ان افسانوں میں دکھائی دیتا ہے' اور جس سطح پر یہ پرانا پن آکر نئے پن کے ساتھ ٹکراتا ہے' یہی اس مجموعے کی خاصیت ہے۔

اور سب سے بڑی خوبی ان افسانوں کی یہ ہے کہ ان کے تخلیق کار کا دل سمندر جیسا وسیع ہے۔ جو ہمدردی ان افسانوں میں ایک ادیب کی اپنے کرداروں کے لئے مجھے محسوس ہوئی ہے' وہ بہت کم ہمارے باقی ادب میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے افسانوں' ہمارے ناولوں کے برے لوگ صرف برے لوگ ہوتے ہیں' ان میں کوئی خوبی دکھائی نہیں جاتی' اچھے لوگ صرف اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ مجال ہے کہیں خواب میں بھی کوئی غلطی کر جائیں۔ لیکن خوشونت سنگھ کی پھپھی کی ہوا میں تھوکی پان کی پیک' معلوم نہیں سرموہن لال تک پہنچتی ہے کہ نہیں پہنچتی۔ بیمے کا ایجنٹ بڑا گھٹیا آدمی ہے' لیکن اس کو ایسا کہنے سے مصنف آخر تک کتراتا رہا ہے۔ اس افسانے میں تخلیق کار کی اپنے کردار سے جو ہمدردی نظر آتی ہے' اس کی مثال مجھے ہندوستان چھوڑ دنیا کے دوسرے افسانوں میں بھی کہیں کہیں ہی دکھائی دیتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ان افسانوں کو اردو حلقوں میں بہت سراہا جائے گا۔

____ کرتار سنگھ دگل 1982ء

# جب دولت رام مرا

جب دولت رام فوت ہوا' کئی باتیں کچھ اس طرح ہوئیں' جو اس کے بیٹے رنگا کو ابھی تک سمجھ نہیں آرہی تھیں وہ بیٹھا ان پر غور کر رہا تھا۔

پہلا اشارہ رنگا کو اکیس جولائی والے دن ہوا' وہ ریسٹورنٹ میں بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ ہر روز وہ اسی طرح کافی پینے جایا کرتا تھا۔ اور یہ ریسٹورنٹ شہر کی ایک صاف ستھری' ازحد طریقے سے سجائی ہوئی جگہ پر تھا۔ گرمیوں میں اس کو ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم رکھنے کی مشینیں بھی لگی ہوئی تھیں اور شہر بھر میں اس سے زیادہ سکون والا ریسٹورنٹ اور کوئی نہیں تھا۔

جولائی کی اس صبح اتنی گرمی نہیں تھی' جو گرمی جولائی میں اکثر ہوتی ہے۔ صبح صبح بارش ہوئی تھی' آسمان پر بادل ابھی ابھی امڈے ہوئے تھے۔ بارش ہونے کی وجہ سے کمرہ ٹھنڈا کرنے کی مشین کچھ خراب ہو گئی تھی۔ کئی لوگ آتے' چھت کی طرف دیکھتے۔ اس ریسٹورنٹ میں پنکھے لگے ہی نہیں تھے۔ لوگ حبس سے گھبرا کر اٹھ اٹھ جاتے۔ صرف وہی لوگ آج بیٹھے تھے' جو روزانہ کے گاہک تھے اور اس طرح کے گاہکوں میں رنگا بھی ایک تھا۔

پھر ریسٹورنٹ کا بینڈ بجنے لگ گیا۔ رنگا کو یہ نہیں سمجھ آیا تھا کہ بینڈ کیا بجا رہا تھا۔ لیکن اس کو تجربہ ہو گیا تھا' کہ جو کچھ بج رہا تھا' کوئی بیگانی سی' عجیب سی دھن تھی۔ اور یہ دھن سنتے ہی اس نے اپنا پیالہ میز پر رکھ دیا اور بٹ بٹ ہوا میں دیکھنے لگا۔ اس کو یوں محسوس ہوا' جیسے بینڈ کی یہ دھن اس کے لئے ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔

جب بینڈ ختم ہوا تو سامنے پڑا ٹیلی فون بجنا شروع ہو گیا۔ رنگا نے دیکھا کہ بیرا ٹیلی فون سنتا کاغذ پر کچھ لکھتا رہا ہے۔ پھر لکھے ہوئے کو پڑھ کر اس نے سارا پیغام دینے والے کو پڑھ کر سنایا اور پھر ریسٹورنٹ کے ہال میں چاروں طرف نظر دوڑا کر رنگا کے پاس آگیا۔

"آپ کا ٹیلی فون ہے۔"

بیرے نے رنگا سے اس کا نام نہیں پوچھا تھا۔ لیکن اس بات کا اس وقت رنگا نے کوئی خیال نہ کیا۔ ٹیلی فون کا سنتے ہی اس کو یوں لگا کہ جیسے ٹیلی فون پر اس کا کوئی بہت بری خبر انتظار کر رہی تھی۔ اس طرح ریسٹورنٹ میں پہلے بھی کئی دفعہ اس کو ٹیلی فون آتے تھے۔ اس کے تمام دوستوں کو معلوم تھا کہ تقریباً" گیارہ بجے وہ کافی پینے آیا کرتا تھا' اور جب بھی وہ دفتر سے اٹھا' ہمیشہ کہہ کر آتا کہ کوئی ضروری بات ہو تو اس کو بلا لیا جائے۔ لیکن آج رنگا کو یقین تھا کہ یہ نہ کوئی دوست تھا اور نہ ہی دفتر والے تھے۔ جب اس نے ٹیلی فون کو اٹھایا' ادھر سے آواز آئی' "آپ کے والد صاحب سخت بیمار ہیں' جلدی گھر آجائیں۔"

رنگا کو یہ آواز ایک بوڑھے آدمی کی معلوم ہوئی۔ لیکن ٹیلی فون پر نہ اس نے پوچھا کہ وہ کون تھا اور نہ ہی اس نے یہ پوچھا' کہ وہ کہاں سے بول رہا تھا۔

اور وہ موٹر میں بیٹھ کر سیدھا گھر چلا گیا۔

یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں تھا کہ دولت رام اچانک اس طرح بیمار ہو گیا تھا۔ اس کو پیشاب کی بیماری تھی۔ ذرا بھی بخار میں اگر وہ بے احتیاطی کرتا' تو اس کے پیٹ میں جیسے شدید درد شروع ہو جاتا۔ لیکن یہ تکلیف کوئی زیادہ دیر تک نہ رہتی۔ ایک دو ہفتے چارپائی پر لیٹ کر وہ دوبارہ ٹھیک ہو جاتا' اور جب بھی وہ اس طرح بیمار ہوتا' ہمیشہ گھر والوں کو جمع کرکے وہ کہتا کہ تمام بیماریوں کی بنیاد ہماری خوراک ہوتی ہے اور اب وہ ہمیشہ احتیاط کرے گا۔ ہمیشہ ابلی ہوئی سبزیاں کھایا کرے گا' اور کھانا کھانے میں ہمیشہ وقت کی پابندی کا خیال رکھا کرے گا۔ "آدمی مرتا نہیں' اپنے آپ کو مارتا ہے۔" پل پل بعد وہ کہتا۔ اور پھر بیماری سے اٹھنے کے بعد کچھ دن وہ اس طرح پاکبازوں والی باتیں کرتا رہتا۔ ہمیشہ شیشے کے شراب پینے والے گلاسوں میں وہ پھلوں کے رس پیتا۔ اپنے مہمانوں کو اپنے ہاتھوں شراب پلاتا' اور خود نہ پیتا۔ لوگوں کو جام بھر بھر کر دیتا اور کہتا' "میں نے شراب چھوڑ دی ہے اور چالیس سال پینے کے بعد یوں پینا چھوڑنا کوئی معمول

بات نہیں، لیکن میں نہیں پیتا۔ اور اب مجھے ضرورت بھی نہیں محسوس ہوتی۔ بلکہ میری صحت پہلے سے بہت اچھی ہے۔"

اس طرح کچھ دن کے بعد، وہ باہر کسی پارٹی میں شامل ہونے کا دعوت نامہ قبول کر لیتا اور وہاں وہ دوسروں کے اصرار کرنے پر ایک چھوٹا پیگ لے لیتا۔ ڈاکٹر نے بھی تو کہا تھا، کہ کبھی کبھار ایک چھوٹا پیگ اگر پی لیا جائے، تو کوئی بات نہیں۔ پھر چھوٹے پیگ سے بڑا اور ایک سے دو اور دو سے تین پیگ ہوتے جاتے۔ اور پھر اس کو مجبور کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور وہ وہسکی کے لئے یوں آرڈر دیتا، جیسے نوکر کو عینک لانے کے لئے کہہ رہا ہو۔ جب اس کی بیوی کسی کام کے لئے باہر جاتی، وہ گلاس کو یکدم ختم کرتا اور فوراً" اور ڈال لیتا۔ اور پھر یوں آرام سے پیتا، جیسے یہ اس کا پہلا ہی جام ہو۔ اور پھر کھانا کھانے سے پہلے ایک چھوٹا جام تو کوئی تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔ اور اگر جب کبھی اس کی بیوی آنکھ تک اٹھاتی، تو وہ اس کو کھانے دوڑتا۔ اور یوں کچھ چوری پی گئی اور کچھ شاہدی پی گئی شراب کے کافی دیر بعد وہ کھانے کھانے کے لئے بیٹھتا۔ اور یہ سالا باورچی ایسی چیزوں کو کیوں نہیں اس طرح ذائقے دار بنا سکتا تھا؟ اور اگر پھر گوشت مچھلی سبزیوں کے ساتھ کھا لی جائے، تو کیا حرج ہے؟ آخر پروٹین بھی کھانے ہی چاہئیں۔ خوراک بابت اس نے کئی کتابیں پڑی تھیں۔ اور اس کو علم تھا کہ کس چیز میں کون سی طاقت ہوتی ہے۔ وہ کھاتا جاتا، کھاتا جاتا، اور پھر اس کا پیٹ درد شروع ہو جاتا۔ وہ سارے محلے کو سر پر اٹھا لیتا۔ اس کی بیوی بار بار کہتی، "آپ نے میری سنی بھی ہو۔" پھر نرسیں آتیں، ڈاکٹر آتے، ٹیکے لگتے، رشتے داروں کو تار بھجوائے جاتے، اور پھر ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں ہوتیں، "اگر خدا نہ کرے، ان کو کچھ ہو ہی جائے---" اور پھر وہ اچھا بھلا ہو جاتا اور پھر اسی طرح کی پاکبازوں والی باتیں کرنا شروع کر دیتا۔

پہلے ایک دو بار تو رنگا کو جب اپنے باپ کی بیماری کی خبر ملی، تو وہ ہمیشہ سوچتا، کہ اس کا باپ ہاتھوں سے گیا۔ شہر والے بھی بار بار اس کی عمر پوچھتے۔ لیکن پھر وہ کئی دفعہ بیمار پڑا، کئی دفعہ حالت خطرناک بھی ہو گئی، لیکن رنگا کو کبھی ڈر نہ لگا۔

لیکن آج اس کو یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے کچھ ہو کر رہے گا۔ اردگرد میں بھی جیسے کچھ وقوع پذیر ہویا ہوا تھا۔ آسمان میں سورج گھنے بادلوں کے پیچھے غائب ہو گیا تھا۔

ہوا یکدم جیسے بند ہو گئی اور کوٹھی کے درخت سر جھکائے نیم مردہ جیسے کھڑے ہوں۔ گھر سارے کا سارا جیسے سنسان ہو۔ دیواروں پر چڑھی بیلیں اس کو یوں محسوس ہوا کہ جیسے یکدم زرد پڑ گئی تھیں' اور ان میں سے جگہ جگہ پر دیواروں کا مٹیالے رنگ کا پلستر دکھائی دے رہا تھا۔

گھر کے باہر کوئی آدم نہ آدم زاد تھا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اکثر کوٹھی کے لان بچوں سے بھرے رہتے تھے' بچے اور ان کی خادمائیں۔ سامنے برآمدے میں ٹیلی فون کے پاس کوئی چپڑاسی کھڑا نہیں تھا۔ باہر کوئی موٹر نہیں آئی ہوئی تھی' اور نہ ہی موتی کہیں نظر آرہا تھا۔ موتی جو بھکاریوں کو کوٹھی کے قریب پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔

آج جب وہ گھر آیا' تو ایک بھکاری اس کو دکھائی دیا۔ وہ سامنے برآمدے کی سیڑھیوں پر گھٹنوں میں سر رکھے بیٹھا تھا۔ دو قدم اس سے دور موتی دم ہلاتا کبھی اس کو بائیں طرف سے دیکھ رہا تھا اور کبھی دائیں طرف سے جھانک رہا تھا۔

"تمہارا یہاں کیا کام ہے؟" رنگا نے بھکاری کو ڈانٹا۔ اس کو بھکاریوں سے سخت نفرت تھی۔

بھکاری نے سر اٹھایا۔ وہ تو کوئی ضعیف بوڑھا تھا' تقریباً" اسی برس کا۔ اس کی سفید داڑھی اس کی ناف تک لٹک رہی تھی۔ اس کے سر پر سفید بال اس کے صافے میں سے نکلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھی تو سفید ہو گئے تھے۔ رنگا کی طرف وہ بوڑھا ایک ٹک دیکھتا رہا۔

رنگا کو کچھ شرم سی محسوس ہوئی' "بابا جی' کیا بات ہے؟" پھر اس نے ذرا نرمی سے پوچھا۔

بوڑھا آدمی یوں کا یوں ہی رنگا کی طرف دیکھتا رہا اور اس نے اپنا سر ہلایا۔ رنگا جیسے پتھر ہو گیا ہو۔ یہ آدمی تو بھکاری معلوم نہیں ہوتا تھا۔ شہر بھکاریوں سے بھرا پڑا تھا۔ پنجاب کی تقسیم کے بعد بھکاری کتنے بڑھ گئے تھے! کوئی شرنارتھی ہو گا۔ اس کے بھی فساد میں رشتے دار مارے گئے ہوں گے۔ لیکن رنگا کو تسلی نہ ہوئی۔ اس کو یوں لگتا تھا کہ جیسے اس آدمی کو اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

"بابا جی! آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

بوڑھے آدمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں میں سے چھم چھم آنسو

گرنے لگ پڑے۔ موتی بوڑھے کے پاس گیا' اس کو سونگھ کر پھر پیچھے ہٹ گیا۔

"کیا' آپ کا رشتے دار کوئی نہیں؟"

بوڑھے نے پھر سر ہلایا۔

رنگا نے سوچا' اس کے ساتھ سر کھپانا فضول ہے۔ "بابا جی' آپ سامنے باورچی خانے کی طرف جائیں۔ میں نوکروں کو کہتا ہوں' وہ آپ کو روٹی دے دیں گے۔"

رنگا اندر جانے لگا' لیکن اس کو یوں محسوس ہوا' جیسے اس کے پاؤں من من بھاری ہو گئے ہوں۔ جیسے بوڑھا بھکاری اس کو پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو۔ مڑ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا' جیسے گھٹنوں میں سر دیئے وہ پھر سو گیا ہو۔

اوپر دولت رام کی حالت ہمیشہ کی طرح خراب تھی۔ اس کے پیٹ میں سخت درد ہو رہا تھا۔ تمام رشتے دار اس کے کمرے میں جمع تھے۔ ایک نرس اس کے بازوؤں پر سپرٹ مل رہی تھی۔ ڈاکٹر نے ٹیکہ لگایا اور دیکھتے دیکھتے مریض کو نیند آ گئی۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ آہستہ آہستہ رشتے دار بھی جانے شروع ہو گئے۔ لیکن موتی وہاں سے ہل نہیں رہا تھا۔ رنگا بڑی مشکل سے اس کو باہر لایا۔

باہر آکر رنگا نے دیکھا کہ اس کی بہن اور بھائی بھی آئے ہوئے تھے۔ دونوں شہر سے دور رہتے تھے۔ ان کو باپ کی بیماری کی خبر تو نہیں ملی ہو گی! بھائی نے بتایا کہ وہ دورے سے آیا ہوا تھا۔ بہن یوں ہی ایک دو دن کے لئے آگئی تھی' کچھ سامان اس نے خریدنا تھا۔

رنگا جیسے بہت خوفزدہ ہو گیا۔ اس گھر میں جب بھی کوئی مرتا تھا' سارا خاندان اچانک جمع ہو جاتا تھا۔ کوئی طاقت تھی' جو سب کو جمع کر دیتی تھی۔ کبھی خطوط' کبھی تاریں اور کبھی یوں ہی اپنے آپ جیسے سب جمع ہو جاتے تھے۔

لیکن رنگا پھر سوچتا' یہ اس کا وہم تھا۔ مریض آرام سے سو گیا تھا۔ اس کے کمرے میں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ موتی بار بار آتا اور کمرے میں جانے کی کوشش کرتا' لیکن اس کو روک دیا جاتا۔

کھانے کی میز کے سامنے میز پر بیٹھے اپنے بھائی سے باتیں کرتے یکدم رنگا کو باہر کا بھکاری فقیر یاد آگیا' اور وہ بدک گیا۔ یوں وہ بدکا اور اس کی نظر اچک کر سامنے دیوار پر لگی اپنے دادا کی تصویر پر جا پڑی۔ یہ تو باہر بیٹھے بھکاری سے ہو بہو ملتی تھی۔ وہی

آنکھیں، وہی پپوٹے، وہی داڑھی، وہی بال، وہی چہرہ۔ رنگا یکدم جیسے ہکا بکا رہ گیا۔ گزشتہ بیس برسوں سے سامنے لٹکی تصویر کو جیسے آج پہلی دفعہ اس نے غور سے دیکھا ہو۔ رنگا کی نگاہیں وہیں کی وہیں جم گئیں، اور اس کے ہاتھوں سے لقمہ پھسل کر پلیٹ میں جاگرا۔

"کیا ہوا؟" اس کے بھائی نے اس سے پوچھا "یوں لگتا ہے، جیسے تم نے کوئی بھوت دیکھا ہو۔"

رنگا یکدم کھڑا ہوا، "بھکاری، بھکاری۔" اس کے منہ سے بے ساختہ ہی نکل گیا۔

"کون بھکاری؟" اس کے بھائی نے پوچھا۔

"میں ایک منٹ میں آیا۔" یہ کہتے ہوئے وہ باہر دوڑ گیا، لیکن بوڑھا فقیر جا چکا تھا۔

رنگا کھانے کے کمرے میں واپس آیا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ "وہ تو چلا گیا، لیکن موتی کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کون چلا گیا، تمہیں ہو کیا رہا ہے؟"

"موتی کہاں ہے؟" رنگا بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ "وہ کہیں والد صاب کے کمرے میں تو نہیں چلا گیا۔"

"نہیں جی، میں تو دروازہ بند کرکے آئی تھی۔" نرس نے اٹھتے ہوئے کہا "میں ابھی جاکر دیکھتی ہوں۔"

نرس کے پیچھے پیچھے سارے چل دیئے۔ سونے والے کمرے کے دروازے کا ایک تختہ کھلا ہوا تھا۔ رنگا دبے پاؤں نرس کے پیچھے پیچھے اندر گیا۔ دولت رام جیسے گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اس کے پلنگ کے پاس موتی بیٹھا ہوا تھا۔۔۔ خاموش، عاجز سا بن کر۔ رنگا کو دیکھ کر موتی نے رونا شروع کر دیا، اور پھر اچانک رنگا نے دیکھا کہ دولت رام تو سانس نہیں لے رہا۔ اور پھر وہ یکدم باہر دوڑ پڑا، "بھکاری، فقیر! وہ چلا گیا، چلا گیا۔"
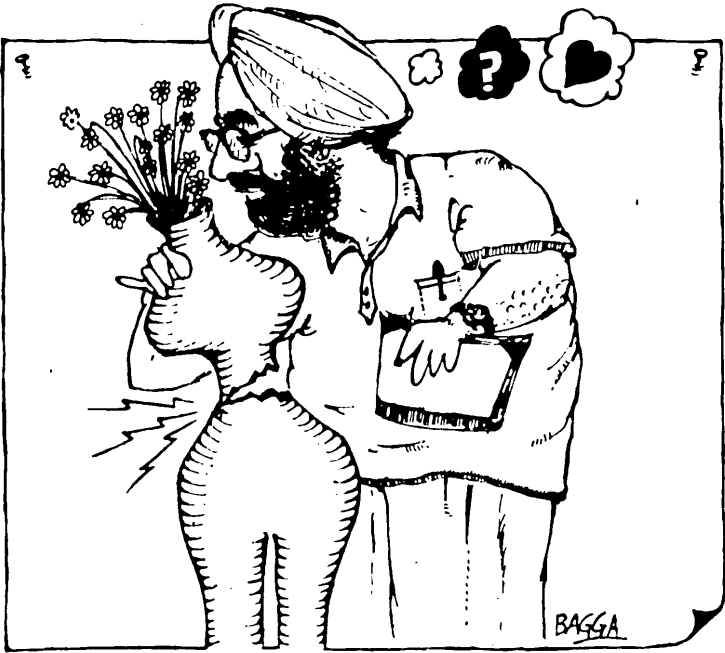
# کالی چمبیلی

"میں مارتھا بول رہی ہوں جی' مارتھا سٹیک۔ پہچانتے ہیں؟ پیرس میں ملے تھے۔ یاد ہے؟--- تیس برس پہلے۔" آواز ملائم تھی--- ملائی جیسی۔ امریکن حبشیوں جیسی۔

"مارتھا!" ٹیلی فون کے منہ میں بینرجی نے زور کے ساتھ کہا' "ہاں! میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ تم یہاں دہلی کیا کر رہی ہو؟ کب آئی تھی؟ تم نے پہلے کیوں نہیں لکھا تھا؟"

"پہلے کیسے لکھتی؟ نیو یارک سے چلنے تک مجھے خود کو بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن یہاں اب میں اشوکا ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔ تمہیں دیکھنے کے لئے اور تمہیں ملنے کے لئے دل بڑا بیتاب ہو رہا ہے۔"

"ٹھہرنا ذرا مارتھا۔" اس نے ٹیلی فون کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی بیوی کے ساتھ بات کی' اور پھر مارتھا کو کہا' "آج شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھانا اور ساتھ ہی میری بیوی اور بچوں سے مل لینا۔"

"کمال ہو گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم بال بچے دار ہو گئے ہو!"

"بیوی ہے' بڑے بڑے بچے ہیں۔ لڑکا بیس سال کا ہے اور لڑکی پندرہ سال کی۔ تم کب کی باتیں کرتی ہو؟ تیس برس ہو گئے ہیں! تمہاری کیا خبر ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ اب تو بالکل ہی نہیں۔ دو شادیاں ہوئی تھیں۔ پھر دم کا دم ہی ہوں۔" وہ اونچی اونچی ہنسی' "بڑی سکھی ہوں۔"

"میں تمہیں سات بجے لینے آؤں گا۔ شام کو! شاید تم سے پہچانا نہ جائے۔ میں پہلے سے موٹا ہو گیا ہوں' اور بال بھی کافی سفید ہو گئے ہیں۔"

"فکر نہ کر پیارے۔ ہم سب ہی موٹے اور بوڑھے ہو جاتے ہیں۔" وہ بولی'

"اچھا پھر سات بجے نمستے۔" اس نے تیس برس پہلے کا یاد کیا ہوا پرنام والا لفظ بولا۔

بینرجی نے فون بند کر دیا۔ "کوئی پرانی سہیلی معلوم ہوتی ہے؟" اس کی بیوی مسکراتی ہوئی بولی۔

"سہیلی کہاں سے؟ یہ عورت مجھے تیس برس پہلے "سور بونے" ملی تھی۔

"اس وقت تم نے مجھے اس طرح نہیں بتایا تھا! وہی نہیں جس کی فوٹو تمہاری البم میں لگی ہوئی ہے؟ بڑی خونخوار چیز ہو گی؟"

"ہاں' دیکھنے کو تو اتنی بری نہیں تھی' لیکن ہے تو حبشن ہی نا۔ موٹے ہونٹ' گھنے گھنگھریالے بال۔ اپنی جماعت میں ہم ہی دو کالے تھے۔ اس لئے ہمیں زبردستی ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔"

اس کو محسوس ہوا کہ اس کی زبان تتلا رہی تھی۔ اس نے اپنی بیوی سے نظر بچانا چاہی' "مجھے اشوکا ہوٹل لینے کے لئے جانا پڑے گا۔ بڑی مصیبت ہے!" اتنا کہہ کر وہ اپنے پڑھنے والے کمرے میں چلا گیا۔

عجیب بات ہے' اس نے اپنے آپ کو کہا۔ تیس برس پہلے اس نے اپنے دوستوں پر مارتھا کی دوستی کا رعب ڈالا تھا۔ اس کی فوٹو اپنی البم میں رکھتا تھا۔ حبشن لڑکی کی ٹھوس اور دلکش تصویر۔ سر پر بیئے جیسی ٹوپی' اور نیچے لکھا تھا' "شیریں مارتھا۔" یہ مارتھا کون ہے؟" اس کے دوست تصویر والا صفحہ کھول کر پوچھتے تھے۔ "نہ سوال پوچھو' نہ جھوٹ سنو۔" وہ مسکرا کر کہہ چھوڑتا تھا۔ اور اب اپنی بیوی کو وہ صرف اتنا ہی کہنا چاہتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے پرانے واقف تھے۔ "شادی کے بعد انسان کو پاکیزہ سے پاکیزہ تعلقات بارے بھی جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔"

پرانے تعلق سے اس کی توجہ سور بونے میں منعقد فرانسیسی ادب بارے ہوئی علمی کانفرنس کی طرف چلی گئی۔ ان کی جماعت میں وہ تقریباً تیس لڑکے لڑکیاں تھیں۔ زیادہ تر طالب علم امریکی تھے' اور تھوڑے سے ڈچ اور سکینڈے نیوئن۔ وہ اور مارتھا

دو ہی تھے' جو کالی نسل کے تھے۔ مارتھا نے پہلے دن سے ہی اس کی توجہ مبذول کرا لی تھی۔ وہ دوسروں سے علیحدہ بیٹھتی تھی۔ وہ اونچی لمبی بہت تھی' لڑکوں سے بھی۔ کالے مشکی رنگ پر گورے بڑا مرتے ہیں۔ دوسرے دن ہی کچھ لڑکے اپنی جان پہچان کروا کر اس کے پاس آ بیٹھے۔ تیسرے دن وہ خود چل کر بینرجی کے پاس آ بیٹھی۔ "کیا میں آپ کے پاس بیٹھ سکتی ہوں؟ میرا نام مارتھا سٹیک ہے' میں امریکن ہوں۔" اس نے ہاتھ پیش کرتی ہوئے کہا' "میرا نام بینرجی ہے۔" بینرجی نے اٹھ کر کھڑے ہو کر استقبال کیا' "میں انڈیا سے ہوں۔" اس کے بعد وہ ہمیشہ ہی ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے رہے تھے--- بینرجی' عام طور سے' جلدی آجاتا تھا۔ وہ ساتھ والی سیٹ پر کاپی رکھ کر سیٹ پر قبضہ کرکے مارتھا کا انتظار کرنے لگ جاتا۔ کمرے میں داخل ہو رہے طالب علموں میں سے مارتھا کی کشادہ پیشانی اور گھونگھریالے بال دور سے ہی نظر آجاتے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی--- کولہوں کو اچھال اچھال کر۔ وہ آہستہ سے آکر بینرجی کے پاس قبضہ کی ہوئی سیٹ پر آکر کھڑی ہوتی۔ "پھر کیا خبر ہے؟" وہ بینرجی کے نزدیک آکر بیٹھ جاتی۔ "خدا کا واسطہ' ہر دفعہ اٹھ کر نہ استقبال کیا کریں۔" یہ کہہ کر وہ اپنے اردگرد چمبیلی کی مہک بکھیر دیتی۔ اس کے باپ نے اس کا نام "یاسمین" کیوں نہ رکھا؟ کتنا خوبصورت نام تھا--- مارتھا سے کتنا زیادہ مناسب تھا!" بینرجی آنکھ بچا کر اپنے ساتھ بیٹھی اس چمبیلی کو دیکھتا رہتا۔ جب وہ لکھنے بیٹھتی' تو اس کی موٹی کالی کلائی میں سونے کی مہروں کا بازو بند چھنک پڑتا۔ اس کے کالے بھوسلے بازو اور بڑی بڑی چھاتیاں--- اس کے جسم کے مقابلے بہت بڑی تھیں۔ گدرائے آم کی طرح گدر۔ وہ باہر جاتی' تو بینرجی اس کے چھڑی جیسے جسم پر جھولتے ہوئے کولہوں کی طرف دیکھتا رہتا۔ جلد ہی لڑکوں نے بینرجی کو مارتھا کا نام لے کر چھیڑنا شروع کر دیا' "قسمت والے ہو بیٹھے۔ تمہارے علاوہ اور کسی کی طرف دیکھتی بھی نہیں۔" وہ ایک دوسرے کے اور نزدیک ہو گئے۔ لیکن ابھی بھی بینرجی کا حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ وہ بینرجی سے بہت زیادہ اونچی تھی--- اور کتنی ہی بڑا فراک۔ کہیں لے جاتا' تو دنیا بھر میں ڈنکا بج جانا تھا۔ لیکن اتنا فاصلہ طے کرکے اور میموں کے ملک پہنچ کر بھی کالی نسل کے ساتھ ہی ماتھا پھوڑنے میں کہاں کی عقلمندی تھی؟ آخر مارتھ کو ہی پہل کرنا پڑی۔ قہوہ پلانے کے لئے وہ ساتھ لے گئی۔ جب بیرا بل لے کر آیا اور بینرجی نے اپنی جیب کی طرف ہاتھ

بڑھایا' تو مارتھا نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنا ہاتھ پورے زور سے دبا دیا' "یہ بل تم نہیں دے سکتے' میں دیتی ہوں۔ تم مجھے لے کر جاؤ گے' تو تم دے دینا۔" مارتھا نے اس وقت تک کلائی نہ چھوڑی' جب تک کہ بیرا پیسے لے کر چلا نہیں گیا۔ اب بیز جی کے لئے بھی اس کو لے جانا لازمی ہو گیا۔ پھر وہ روزانہ اکٹھے ہی قہوہ پیتے۔ کبھی مارتھا پیسے دے دیتی اور کبھی بینرجی۔ لیکن نہ ہی بینرجی کو اپنا ہاتھ جیب کی طرف لے جانے سے کوئی روکتا تھا اور نہ ہی مارتھا کو پکڑے؟ اتنی سی دوستی ہو جانے کے بعد مارتھا نے اگلا قدم اٹھایا' "خدا کے واسطے مجھے کماری سٹیک نہ کہا کرو! میں تمہارے لئے مارتھا ہوں۔ صرف مارتھا۔ تمہیں پیار سے کیا بلاتے ہیں؟"

"میرا اصل نام تو ہیرین ہے' لیکن مجھے گھر میں سب گلو کہہ کر بلاتے ہیں۔"

"تو میرے لئے بھی گلو ہو۔" مارتھا نے اس کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ بینرجی نے مارتھا کو بتایا کہ وہ اس کو مارتھا کی بجائے کالی چمیلی کہہ کر پکارا کرے گا۔ چمیلی لفظ یاسمین کا بھارتی ترجمہ تھا۔ مارتھا نے بینرجی کا ہاتھ پوری گرم جوشی کے ساتھ دبایا اور کہا' "تم نے میرا بڑا اچھا نام رکھا ہے۔ مجھے چمیلی بہت پسند ہے' اور ساری دنیا میں صرف تم ہی مجھے اس نام سے پکارو گے۔" وہ اس کے اور نزدیک ہو گئی۔ مارتھا کے سانسوں میں سے چمیلی کی نیم گرم خوشبو اس کے ماتھے کو محسوس ہوئی۔ اس کے سانسوں میں حبشی سانسوں والی باس شامل تھی' جس کے متعلق بینرجی کے دوست اس کے ساتھ باتیں کیا کرتے تھے۔ اس کو یہ اچھی اچھی' نیم گرم اور جنس آلودہ محسوس ہوئی --- میموں کے جسموں میں سے آنے والی پھٹے ہوئے دودھ کی باس سے کہیں اچھی --- اگر میں تمہیں فرانسیسی ناموں سے پکارا کروں --- جیمی' وائس ایمی' ناؤس ایمنز ---" وہ ہنستی ہوئی دوہری ہو گئی۔

بینرجی سارا سارا دن یہی سوچتا رہتا کہ وہ مارتھا سے کب کیا کرے گا۔ لیکن جب بھی موقع آتا' تو جھجک کر پیچھے ہٹ جاتا۔ کالج بند ہونے میں صرف دس دن رہ گئے۔

مارتھا نے ایک موقع اور دیا۔ "آخری ہفتہ ہے!" اس نے آہ بھر کر کہا' "قسمت" بینرجی نے جواب دیا۔ "وقت کیسے گزر جاتا ہے!" مارتھا یہاں ہی بس نہیں کرنا چاہتی تھی' "چلو' کہیں تنہائی والی جگہ پر چلیں' پھر نہ معلوم کب ملنا ہے' کہ نہیں۔" وہ بولی' "کہیں دور نکل جائیں۔" اس نے لمبا سانس لے کر کہا' "کہیں بہت دور سین دریا کے

کنارے، جہاں کھلے میں نہا کر دھوپ میں لیٹے رہیں۔"

اگست مہینے کا دن تھا اور دھوپ تھی۔ وہ پیرس سے پہلی گاڑی پر سوار ہو گئے۔ گاڑی میں مسافر بہت کم تھے۔ ایک خالی ڈبے میں وہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے دیکھتے رہے۔ مارتھا بہت سارے امریکن رسالے لائی تھی۔ بینرجی ان رسالوں میں گم مارتھا سے لاتعلق بیٹھا رہا۔ وہ پیرس اور پیرس کے لوگوں سے دوستی کی باتیں کرتی رہی۔ وہ ایک دوسرے سے مزید نزدیک ہوئے بغیر ہی منزل پر پہنچ گئے۔ دریائے سین کے کنارے نہانے والوں کا کوئی شمار ہی نہیں تھا۔ سب نگاہیں مارتھا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ اس کا پیراکی کا لباس، اس کے جسم کے ابھاروں کو مزید ابھار کر پیش کر رہا تھا۔ اس کا بدن جیسے چابک کی طرح لہرا رہا ہو۔ ایک نوجوان ٹولے نے شرارت کے لئے اپنا فٹ بال اس کی طرف اچھال دیا۔ مارتھا نے فٹ بال اس طرح دور پھینکا، جیسے مشاق کھلاڑی پھینکتا ہے۔ فٹ بال نوجوانوں کے سروں سے ہوتا ہوا دور جا گرا۔ مارتھا نے لمبی تیراکی کی اور آکر ریت پر دھوپ سینکنے کے لئے لیٹ گئی۔ بینرجی کپڑے کی آرام کرسی میں بیٹھا امریکن رسالے پلٹتا رہا۔ واپسی پر گاڑی پکنک منا کر آئے لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اچھی قسمت سے ان کو ایک دوسرے کے نزدیک جگہ مل گئی۔ کچھ منٹوں میں ہی لوگ کھڑکیوں تک بھر گئے۔ ڈبہ قہقہوں اور سگریٹوں کے دھوئیں سے بھر گیا۔ مارتھا کا ہاتھ تو بینرجی کے گھٹنے تک چلا گیا، اور پھر اس نے بینرجی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنی انگلیاں بھینچ کر بینرجی کی انگلیوں میں پھنسا دیں۔

بہت سارے لوگ ایک ایک کرکے اتر گئے۔ ہر اسٹیشن پر ڈبہ اور خالی ہو جاتا۔ "گارے ڈی اولینز" اسٹیشن سے ایک اسٹیشن پہلے بینرجی اور مارتھا اکیلے رہ گئے۔ ان کے ہاتھ اسی طرح ایک دوسرے کے ہاتھوں میں تھے۔ بینرجی دھوئیں آلود گھروں اور ڈبوں کی قطاریں دیکھنے میں بہت زیادہ مگن تھا۔ مارتھا نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور کھسکا کھسکا کر بینرجی کی گردن پر لے گئی، اور پھر اس نے بے ساختہ بینرجی کو کان کے پاس اس کو چوم لیا۔ بینرجی نے ہاتھ والا رسالہ ایک طرف رکھ دیا اور مارتھا کی طرف دیکھنے لگا۔ مارتھا نے اس کو اپنے بازوؤں میں بھینچ کر اپنے موٹے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اس نے مارتھا کے گالوں اور کانوں کو چوم چوم کر برا حال کر دیا۔ بینرجی کی

گردن پر تیزی اتنی سے دانت گاڑھے کہ اس کی گردن پر لپ سٹک والے دانت کا نشان پڑ گیا۔ بینر جی نے ہتھیار ڈال دیئے۔ حبشی لڑکی کا نیم گرم سانس اس کے چہرے اور گردن پر حبشی جسم کی کھٹی کھٹی بو چھڑکنے لگا۔ گاڑی آہستہ ہو گئی۔ مارتھا نے اس کے گرد حمائل بازو ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اپنے پرس میں سے کاغذی نیپکن کا پیکٹ نکالا' "لو گلو بچے' چہرہ صاف کر لو۔ میں نے تمہارے چہرے کا برا حال کر دیا۔" بینر جی اپنے ہونٹ' آنکھیں اور ٹھوڑی پونچھنے لگ گیا' اور مارتھا نے اپنے ہونٹ اور گال دوبارہ سرخ گلال کر لئے۔ گاڑی "گارے ڈی اولینز" اسٹیشن پر رک گئی۔

سٹوڈنٹ قہوہ ہاؤس میں انہوں نے قہوے کا ایک ایک پیالہ پیا۔ مارتھا نے بازو پھیلائے اور گھٹی دبی سی انگڑائی لینے کی کوشش کی۔ "میں تھک گئی ہوں' یہ نہانا' ریت میں لیٹنا اور سب کچھ! ہم اپنے گھر چلتے ہیں۔ میں گھر سے تھوڑی وہسکی پلا دوں گی' جس سے تمہارا بقایا سفر آسان ہو جائے گا۔" بینر جی سب سمجھتا تھا' کہ کیا ہونے والا ہے۔ کیا وہ آج اس سے ٹکرانے کے قابل تھا؟

ایک چھوٹا سا کمرہ تھا ـــــ ایک بستر' ایک آرام کرسی اور ایک میز۔ میز کے اوپر چوکھٹے میں مارتھا کے سارے خاندان کی تصویر لگی تھی۔ اس کے ماں باپ' دو بھائی' دو بہنیں ـــــ سب ہی بڑے بڑے' مضبوط اور حبشی جیسے۔ فرش پر طرح طرح کے امریکن رسالے پڑے تھے۔ کپڑے بستر پر بکھرے پڑے تھے۔ مارتھا نے "سن زیئوز" کے دو بڑے پیگ ڈالے اور ایک بینر جی کو پکڑا دیا۔ "اٹھا لو گلو' یہ جام ہمارے لئے اور ہماری صحت کے لئے۔" اس نے گلاس اٹھاتے بینر جی کے ہونٹوں کو چوم لیا۔

"ہاں' یہ جام ہمارے لئے ہے' مارتھا۔" بینر جی نے اتنا کہہ کر مارتھا کو دوبارہ دیکھنے کے لئے راغب کیا۔ مارتھا اپنا گلاس ایک سانس میں ہی پی گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے بینر جی کے کاندھوں کو پکڑ کر اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا' "میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکوں گی' گلو۔"

"میرا بھی دل نہیں لگتا۔" بینر جی نے بھی کہہ دیا۔ بینر جی کی نگاہ اس کی چھاتیوں پر تھی۔ "تم کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے اپنے ہاتھ اسی طرح کاندھوں پر گاڑ کر کہا۔ بینر جی نے تمتمائی آواز میں کہا' "تم نہیں جانتی مارتھا کہ تمہیں دیکھ کر مجھے وینس کی تصویر یاد آجاتی ہے۔ معلوم ہے میں کس تصویر کا ذکر کر رہا ہوں؟ ولایتی مصور کی بنائی

ہوئی ـــــ جس میں وینس سمندر میں سے ظاہر ہوتی دکھائی گئی ہے!"

"وینس جنم؟ مجھے کبھی کسی نے اتنا بڑا کمپلیمنٹ نہیں دیا۔ آؤ ایک ایک پیگ اور لیں!" دوبارہ گلاس پکڑاتے بینر جی کا ماتھا چوما اور اپنا بازو سر کے نیچے دے کر بستر پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گئی۔ بینر جی کی آنکھیں مارتھا کے جسم کو سہلاتی رہیں۔ "ٹکٹکی لگا کر کیا دیکھ رہے ہو؟ کوئی دیکھے تو کہے' جیسے تم نے زندگی بھر عورت نہیں دیکھی۔"

بینر جی نے گلا صاف کیا' "سچ ہی تو ہے' تمہارے جیسی تو کبھی نہیں دیکھی۔" پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ مارتھا نے گلاس میں سے باقی ماندہ گھونٹ بھی پی لیا۔ "اگر تم وعدہ کرو کہ مجھے چھیڑو گے نہیں' تو میں تمہیں اپنا سارا جسم دکھا سکتی ہوں۔ میرا جسم بڑا خوبصورت ہے۔"

"وعدہ کیا۔"

مارتھا نے اٹھ کر لائٹ آف کر دی' اور کپڑوں کی سرسراہٹ اور فیتوں کے کھلنے کی آواز آنے لگی' "اب تم بے شک لائٹ آن کر دو۔" مارتھا نے کپڑے اتار کر کہا۔ بینر جی اپنی کرسی سے اٹھا۔ اس کی آنکھیں مارتھا کے اس ننگے جسم پر گڑ گئیں' جس کو سٹریٹ لائٹ چمکا رہی تھی۔ اس کے کانپتے ہاتھ دیوار کو ٹٹولنے لگے۔ اس کو لائٹ کا سوئچ مل گیا۔ اس نے سوئچ دبا دیا۔ کمرہ دوبارہ روشنی سے بھر گیا۔ مارتھا کی بڑی بڑی چھاتیوں اور ان کی سیاہ ترین ڈوڈیوں (نپل) نے بینر جی کو مسحور کر دیا۔ بڑی کوشش سے اس نے اپنی نظر نیچے کی طرف سرکائی ـــ اس کے چوڑے چکلے کولہے اور موٹی گولائی والی رانوں کی طرف۔

اس نے انگڑائی لے کر اپنے بازو سر کے گرد لپیٹ لئے اور ہاتھوں کے بل اپنے جسم کو پورا چکر دے کر بولی' "کیوں؟ پسند آئی؟ چیز ہوں نا؟" بینر جی نے اپنے منہ میں آیا پانی اندر نگل کر کہا' "ایک نمبر۔" اور دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا' "آؤ' مجھے چوم لو۔" اور مارتھا نے بینر جی کو بازوؤں میں لے لیا۔ اس نے وعدہ کیا ہوا تھا' کہ وہ اس کو کچھ نہیں کہے گا' اور اب ـــ اس نے مارتھا کی چھاتیوں کی ڈوڈیوں کو منہ میں لے کر زور سے چوسا۔ اس کے بعد اس نے مارتھا کے چوڑے پیٹ اور ناف کو چوما۔ مارتھا نے بالوں سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف گھما لیا' "صبر۔" اس نے حکم دیا۔ اپنی ٹانگیں بینر جی کی ٹانگوں کے گرد لپیٹ کر اس نے بھوکوں کی طرح بینر جی کا منہ اپنے

منہ میں لے لیا۔ بینرجی کا سارا جسم گرم اور رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ مارتھا کی ہم آغوشی نے جیسے اس میں سے ساری طاقت چوس لی ہو۔ اس کا سانس اور اس کے جسم کی باس اس کو بدبو دینے لگی۔

"کیا ہو گیا' دلبر!" ذرا پیچھے ہٹ کر مارتھا نے پوچھا۔

"اب بہت ہو گیا۔ مجھے گھر جانا چاہیئے۔"

"اچھا' جیسے تمہاری مرضی۔" مارتھا نے اپنا گاؤن لپیٹ کر سگریٹ سلگا لیا۔ ساتھ ہی اس کے ماتھے پر ایک تیوری بھی ابھر آئی۔

"نہیں' نہیں' مارتھا۔ میرا مطلب یہ نہیں۔" وہ بولا' "میں تو صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر تم چاہتی ہی نہیں کہ --- تو میں چلا ہی جاؤں تو ٹھیک ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔"

وہ دونوں خاموش بیٹھ گئے۔ بینرجی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ٹھنڈا اور بے جان پڑا تھا۔ اس نے اپنا سگریٹ منہ سے نکال لیا' "مَیں تھک گئی ہوں' میری جان۔" وہ اٹھ کر بولی۔ دن بڑا اچھا گزر گیا' شکریہ۔" اس نے بینرجی کی پیشانی پر ایک ٹھنڈا بوسہ دیا اور ایک طرح کی تھپکی سی دے کر باہر نکال دیا۔ بعد میں دروازے کے زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔

تین دن کے بعد وہ مارتھا کو "گارے سینٹ لیزرارے" ساحل پر لے جا کر کشتیوں کی گاڑی میں سوار کر آیا۔ اس بات کو اب تیس برس گزر چکے تھے۔

کئی برس تک مارتھا کا اس اندھیرے کمرے میں اس دن کا کھڑے ہونا بینرجی کی سیکس کو اکساتا رہا۔ چاہے اس نے مارتھا کی تسلی نہیں کی تھی' پھر بھی اس کی یاد اس کے دل پر سوار رہتی۔ وہ اپنی بیوی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی مارتھا کی مدد لیتا' اور زیادہ مرتبہ شریمتی منورما بینرجی کی جگہ پیار اور سیکس کا یہ خزانہ مس مارتھا سٹیک کی ہی نظر ہوتا۔ آٹھ گھنٹے روزانہ کی سخت محنت نے جو ہفتے میں چھ دن کرنا پڑتی تھی' بینرجی کے جسم کے پرزے اڑا دیئے۔ وقت کے ساتھ چاکلیٹ رنگ کی ننگی مارتھا' اس کی بڑی بڑی کالی چھاتیاں اور سرسر کرتے کولہے' کسی بھی چیز کا بینرجی پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب تو منورما بینرجی کے ساتھ سوئے ہوئے بھی سال نہیں' تو مہینے گزر ہی جاتے تھے۔

"کوئی بات نہیں بچے! سب ہی ایک دن بوڑھے ہوتے ہیں۔" مارتھا کے ٹیلی فون نے بینرجی کو جھنجھوڑ دیا۔

جب اس کو اشوکا ہوٹل لاؤنج میں کوئی حبشی عورت دکھائی نہ دی، تو اس نے مارتھا کے کمرے میں ٹیلی فون کیا، "ابھی آئی، ایک منٹ۔ دہلی کی سیر کے لئے گئی تھی۔ سوچا، میں رات کے کھانے کے لئے کپڑے بھی تبدیل کر لوں۔ صرف ایک سیکنڈ لوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

لفٹ آتی، اور امریکنوں کے ٹولے اتار کا وپر چڑھ جاتی۔ پھر ایک لفٹ میں صرف ایک سواری آئی۔ اس میں مزید سواریاں آہی نہیں سکتی تھیں۔ یہ تھی مارتھا۔ چھ فٹ اونچی اور چوڑی چکلی۔ لفٹ سے اتر کر اس نے اپنی موٹے تھل تھل کرتے بازو بینرجی کی طرف بڑھائے، "تم موٹے ہو گئے ہو جانی۔" اس نے بینرجی کے تھوڑے سے بڑے ہوئے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ بینرجی نے بے جان سا ہاتھ پیش کیا، "تو تم بھی تو پہلے والی مارتھا نہیں رہی۔"

ماتھا اپنی بڑی کشادہ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی، "پرانے دوستوں کو اس طرح تو نہیں کہا کرتے؟" اور پھر وہ اونچی اونچی مردانہ ہنسی میں ہنسی۔ "میں تھوڑی سی موٹی ہو گئی ہوں، ہے نا؟ لیکن میں واپسی تک اتنا سا بوجھ تو چھوڑ ہی دوں گی۔"

وہ بھاگ کر کاونٹر پر اپنے کمرے کی چابی دے آئی۔ بینرجی اس میں آئی تبدیلی دیکھ کر لڑکھڑا گیا۔ اس کی پیٹھ بہت ہی بھاری اور تھل تھل ہو گئی تھی۔ اس کی کمر، اس کی چھاتیاں تو پیٹھ سے بھی زیادہ بھاری ہو گئی تھیں۔ اب تو اس کی گردن پر بھی ڈھیروں ماس چڑھ گیا تھا۔ اس کی کھلاڑیوں جیسی ٹانگیں بھی برتن مانجھنے والی میموں کی ٹانگوں کی طرح تھل تھل کر رہی تھیں۔ وہ پیکڈ لنچ دینے والوں کے اشتہار دینے والی آنٹ جیمینا جیسی معلوم ہو رہی تھی۔

ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے اس نے بینرجی کے گرد بازو حمائل کر دیئے۔ ہوٹل کے نوکر چاکر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔ بڑے پہرے دار نے رات کے چوکیدار کو کچھ کہا اور ہنس پڑا۔ مارتھا کی آواز بھی اس کے لباس جتنی ہی بھاری تھی۔ وہ بینرجی کی چھوٹی فیئٹ گاڑی میں سکڑ کر بیٹھ گئی، "یہ گاڑیاں بڑے

امریکن قد کاٹھ والوں کے لئے نہیں بنیں۔" اتنا کہہ کر وہ ہنس پڑی۔

گھر میں مارتھا بڑی ادب آداب سے سب کو ملی' "واہ واہ تمہارے او بوڑھے! تمہیں اتنی پیاری بیوی کہاں سے ہاتھ لگ گئی؟" اتنا سن کر شریمتی منورما بینرجی بڑی خوش ہوئی۔ پھر اس نے تحفے تقسیم کرنے شروع کئے۔ بینرجی کی لڑکی کو لپ اسٹک' لڑکے کے لئے پتلون اور شریمتی منورما بینرجی کے لئے پاؤڈر کا ڈبہ۔ منورما بینرجی بھی بڑی چاہت سے ملی۔ اگر کبھی بینرجی' مارتھا پر مرتا بھی تھا' اب تو اس طرح کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ شام اچھی گزر گئی۔

مارتھا نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا' "میں نے صبح جلدی جانا ہے' جہاز بہت سویرے جاتا ہے۔ میرا خیال ہے' مجھے اب چلنا چاہئے۔ کیا میں ٹیکسی منگوا سکتی ہوں؟"

"یہ آپ کو چھوڑ آتے ہیں۔" شریمتی منورما بینرجی نے بینرجی کی طرف اشارہ کیا' "ہمارا ابھی تو آپ کو الوداع کرنے کو دل بھی نہیں کرتا۔" شریمتی بینرجی جانتی تھی' کہ اگر وہ ذرا خوبصورت ہوتی' تو یا تو شریمتی نے خود ساتھ چل پڑنا تھا' یا پھر کسی بچے کو بھیج دینا تھا کہ ہوا پھانک آئے۔

مارتھا نے شریمتی بینرجی کے بچوں کو الوداعی بوسہ دیا اور پھر دوبارہ اپنے آپ کو سکیڑ کر چھوٹی نیٹ گاڑی میں بیٹھ گئی' "تمہارا کنبہ کافی خوبصورت ہے۔" وہ بولی' "تمہاری بیوی تو واقعی بڑی حسین ہے' اپنی جوانی میں تو ایک نمبر پٹاخہ ہو گی۔"

"میری بیوی نے اپنے جسم کو مجھ سے زیادہ سنبھال کر رکھا ہے۔" بینرجی نے ہاں میں ہاں ملائی' "کئی لوگوں کی کاٹھی ہی ایسی ہوتی ہے۔"

اس نے دلیری سے مارتھا کا بازو پکڑا اور کاؤنٹر کی طرف لے گیا۔ مارتھا نے پھر اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور کہا' "اگر جلدی جلدی ایک پیگ لگانا ہے' تو میرے ساتھ آجاؤ' ہے تھوڑی سی۔ میں رات کی بے خوابی صبح ہوائی جہاز میں اتار لوں گی۔"

"پرانے وقتوں کی یاد میں' ہو جائے پھر۔" بینرجی نے لفٹ میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔ مارتھا کی گھر والی نے تو مارتھا کو عورت سمجھا ہی نہیں تھا۔ لیکن بینرجی نے سوچا کہ اس کا فرض بنتا ہے کہ اس کو ذرا خوش کرکے بھیجے۔"

مارتھا نے غسل خانے میں سے دو گلاس پکڑے اور الماری میں سے اسکاچ کی بوتل نکال لائی۔ اس نے روشنی میں بوتل دیکھی' تو آدھی بھری ہوئی تھی' "ختم کر دینی

چاہئے۔ وہسکی بچا کر لے جانے کا کیا مطلب؟ سوڈا کہ پانی؟"
"میرے لئے تھوڑا سوڈا ہی ٹھیک ہے۔" بینرجی اپنا پیگ پکڑنے کے لئے اٹھا۔ دونوں نے گلاس ٹکرائے اور بینرجی نے مارتھا کے ہونٹوں کا گرم بوسہ لیا۔
"میں ابھی تک تمہارا بوسہ بھولی نہیں۔ اب کی بات دوسری ہے۔ اب میں بہت موٹی ہو گئی ہوں۔" اس نے قہقہ لگایا۔ اس کے سرخ مسوڑھے تنگ ہو گئے' "شکریہ گلو۔ میرا سفر کامیاب ہو گیا' میں سوچ رہی تھی کہ تم میرا دوبارہ بوسہ لو گے بھی یا نہیں۔"

اس نے ایک پیگ اور ڈالا اور آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ بینرجی نے اس کو اشارہ کر کے صوفے پر بیٹھ جانے کے لئے کہا' "بیٹھ لو ذرا۔" اس کا مطلب یہ تھا کہ بینرجی کو نزدیک نہیں آنا چاہئے۔ بینرجی کو اس کے گلے میں پڑا سونے کا ہار اور اس کی چھاتیوں کے درمیان لٹکتی صلیب دکھائی دے رہی تھی۔ شاید اب وہ مذہبی ہو گئی تھی۔ یا پھر اس کی طرح ہی بوڑھی ہونے کے باعث سیکس کی طرف توجہ نہیں تھی۔ بینرجی اپنا پیگ چڑھا گیا۔ اس کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ مارتھا کی نگاہ سے نگاہ ملائے۔ لیکن پھر وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا تھا' جس سے مارتھا کو دکھ ہو۔ اس نے خود ہی تیسرا پیگ ڈالا ور آ کر مارتھا کی آرام کرسی کے بازو پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا' اس کی جلد چکنائی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے اپنی انگلیوں سے مارتھا کے بالوں میں کنگھی کرنا چاہا۔ اس کے بال خاردار باڑھ کی طرح تھے۔ اس نے مارتھا کی طرف جھک کر دیکھا۔ مارتھا نے آنکھیں بند کر لی تھیں' وہ ایک خمار میں بیٹھی تھی۔ بینرجی نے اس کا چہرہ اٹھایا اور اوپر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ بے حس بیٹھی رہی۔ اس نے اپنا منہ تک نہ کھولا۔ بینرجی کو محسوس ہوا کہ مارتھا کو اس پر یقین ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کھسک کر اس کی ٹانگوں کے قریب جا بیٹھا اور اس دفعہ اس نے زیادہ نرمی والا بوسہ دیا۔

پیرس میں دیکھی' مارتھا کے بدن کا خیال آتے ہی اس کے جسم میں حرارت سی آ گئی۔ دونوں کرسی سے کھسک کر فرش پر ہو گئے۔ مارتھا لیٹ گئی--- گوشت کا پہاڑ کا پہاڑ' بے جان۔ اس کی آنکھیں اسی طرح بند تھیں--- جیسے اس کو اپنا سراپا دیکھنے میں شرم آ رہی ہو۔ بینرجی کے ہاتھ مارتھا کا نیفہ اور فیتے ٹٹول رہے تھے اس نے تھوڑا سا

انکار کرنے کی کوشش کی، ''تمہاری بیوی کیا کہے گی؟''

لیکن بینر جی جانتا تھا کہ وہ دوبارہ مارتھا کی تحقیر نہیں کر سکتا تھا۔

Painting Courtesy: M.F. Hussain
(reproduced in B&W)

# کیا نزدیک کیا دُور

سر موہن لال نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ وہ ایک ریلوے اسٹیشن کے فرسٹ کلاس کے ویٹنگ روم میں ٹھہرا ہوا تھا۔ آئینہ واضح طور سے دیسی تھا' کہیں سے چٹخا ہوا' کہیں سے پالش اترا ہوا۔ سر موہن لال کو آئینے پر افسوس بھی آیا اور ترس بھی آیا' اور پھر اس کی ہنسی نکل گئی۔

"تم بھی اس ملک کی ہر ایک چیز کی طرح بیکار' بیہودہ اور فضول ہو۔" سر موہن لال آہستہ سے بڑبڑایا۔

آئینہ' آئینہ دیکھنے والے پر مسکرایا' اور پھر جیسے اس نے کہا' "تم مزے کرتے ہو' میرے یار! عزت' آبرو' قابلیت اور رنگ روپ' خدا نے تمہیں سب کچھ دیا ہے۔ کیسے تم مونچھوں کو تاؤ دیتے ہو۔ ولایتی سوٹ' کوٹ کے کالر میں پھول' عطر پاؤڈروں اور ولایت' صابنوں کا سہارا لے کر تم خوشبو ہی خوشبو بکھیر رہے ہو۔ ہاں میرے یار! تم مزے کرتے ہو۔"

سر موہن لال نے چھاتی کو اور نکال کر دیکھا۔ ولایتی نکٹائی کو دوبارہ ایک ہاتھ لگا کر محسوس کیا' اور پھر کہیں جاکر آئینے کو چھٹی دی۔

سر موہن لال نے اپنی گھڑی کو دیکھا۔ اگر مل جائے' تو ایک پیگ مزید وہ چڑھا سکتا تھا۔

"کوئی ہے؟"

سفید کپڑے پہنے جالی کے دروازے کے پیچھے سے ایک بیرا آیا۔

"ایک چھوٹا۔" سر موہن لال نے آرڈر دیا اور پھر وہ بید کی گہری کرسی میں دھنس گیا۔

شراب پیتا رہا اور سوچتا رہا۔

ویٹنگ روم کے باہر سر موہن لال کا سامان دیوار کے پاس رکھا پڑا تھا۔ ایک ٹرنک پر بچھی، سرموہن لال کی دھرم پتنی، بیٹھی پان چبا رہی تھی۔ وہ پرانے اخبار سے اپنے آپ کو پنکھے کی ہوا دے رہی تھی۔ بچھی قد کی چھوٹی تھی، جسم کی بھاری اور عمر میں تقریباً" چالیس سال کے قریب ہو گی۔ ایک میلی سی سفید دھوتی اس نے باندھی ہوئی تھی۔ میلی سفید دھوتی کا کنارا سرخ تھا۔ ناک میں اس کے لونگ تھا۔ لونگ میں سچا موتی جڑا تھا۔ اس کی کلائیاں سونے کی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ کتنی ہی دیر سے وہ بیرے کے ساتھ باتیں کر رہی تھی، اور پھر سر موہن لال نے بیرے کو اندر بلا لیا۔

بیرا اندر گیا، تو بچھی نے سامنے جاتے ہوئے ایک قلی کو آواز دے دی۔

"ارے بھائی، زنانہ ڈبہ کہاں پر آتا ہے؟"

"پلیٹ فارم کے بالکل آخیر پر مائی۔"

"تو پھر مجھے وہاں لے چلو۔"

قلی نے اپنے صافے کا انو بنایا۔ لوہے کے ٹرنک کو سر پر رکھا اور آگے آگے چل دیا۔ شریمتی موہن لال اپنا ناشتہ دان اٹھائے اس کے پیچھے چل دی۔ راستے میں اس نے ایک چھابڑی والے سے پان خرید کر اپنی چاندی کی ڈبیہ بھر لی۔ پلیٹ فارم کے دوسرے سرے پر پہنچ کر وہ دوبارہ ٹرنک پر بیٹھ گئی اور قلی کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

"کیا اس لائن پر گاڑیاں بھری ہی آتی ہیں؟"

"آج کل تو تمام گاڑیاں ٹھسا ٹھس بھری ہوتی ہیں، مائی! لیکن تمہیں زنانہ ڈبے میں جگہ مل جائے گی۔"

"تو پھر میں یہ روٹی کا پھندہ بھی بیچ میں سے نکال دوں۔"

شریمتی موہن لال نے ناشتہ دان کھولا اور اس میں سے مڑی تڑی روٹیاں نکال کر ان پر آم کا اچار رکھ کر کھانے لگی۔ جب وہ روٹی کھا رہی تھی، تو قلی اس کے سامنے ایڑیوں کے بل بیٹھا زمین پر لکیریں کھینچنے لگا۔

"کیوں بہن، تم اکیلی ہی جا رہی ہو؟"

"کیونکر؟ میرا سائیں میرے ساتھ ہے' بھرلوا! وہ ویٹنگ روم میں ہے۔ وہ تو فرسٹ کلاس میں سفر کرتا ہے۔ وہ تو وزیر ہے اور بلسٹر (بیرسٹر) ہے اور گاڑی میں افسروں اور صاحب لوگوں سے اس نے ملنا ہوتا ہے۔ میں تو اپنی انٹر کلاس کے زنانہ ڈبے میں ہی آتی جاتی ہوں۔"

پچھی خوشی خوشی باتیں کرتی رہی۔ باتیں کرنے کا اس کو شوق بڑا تھا' اور اس کے گھر میں کوئی باتیں کرنے والا نہیں تھا۔ اس کے خاوند کے پاس اس کے لئے فرصت کہاں؟ وہ چوبارے میں رہتی تھی اور اس کا خاوند نیچے۔ خاوند کو اپنی بیوی کے غریب رشتے دار بھی کوٹھی کے آگے پیچھے پھرتے اچھے نہیں لگتے تھے' اس لئے ان کو بھی آنا بند کر دیا گیا تھا۔

آخر سگنل ہوا اور گھنٹی بجی۔ گاڑی آرہی تھی۔ شریمتی موہن لال نے جلدی جلدی روٹی ختم کی اور اچاری آم کی گٹھلی کو چوستے چوستے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نلکے پر ہاتھ دھونے اور کلی کرنے جاتے اس نے زور کا ایک ڈکار مارا۔ ہاتھ منہ دھو کر اس نے اپنی دھوتی کے پلو سے ان کو صاف کیا اور لاکھ لاکھ خدا کا شکر ادا کرتی ہوئی اپنے ٹرنک کے پاس دوبارہ آکھڑی ہوئی۔

گاڑی آگئی۔ بالکل پچھی کے سامنے انٹر کلاس کا زنانہ ڈبہ تھا۔ اس کے ساتھ گارڈ کا ڈبہ تھا اور پھر گاڑی ختم ہو جاتی تھی۔ زنانہ ڈبہ خالی تھا' لیکن باقی کی تمام گاڑی جیسے ٹھسا ٹھس بھری ہوئی ہو۔ پچھی اپنے آپ کو سنبھالتی سمٹتی اندر کھڑکی کے پاس ایک سیٹ پر جا بیٹھی۔ دھوتی کی ڈب میں بندھی ایک دونی نکال کر اس کو قلی کو چلتا کیا۔ اور پانوں کی ڈبیہ میں سے ایک پان کھایا' اور کھڑکی پر اپنی کہنی رکھ کر باہر پلیٹ فارم پر رونق دیکھنے لگی۔ اس کے گال پان کے تھوک سے پھولتے جا رہے تھے۔

سر موہن لال جیسے ٹھنڈے مزاج کے آدمی کو گاڑی کے آنے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ وہ اپنی وہسکی پیتا رہا۔ صرف بیرے کو اس نے بلا کر کہا' جب سامان رکھا جائے' وہ اس کو بتا دے۔ گھبرانا' جلدی کرنا' خاندانی ہونے کی تھوڑی نشانیاں تھیں؟ اور موہن لال ایک مہذب گھرانے سے تھا' جو کام بھی کرتے فخر سے' حوصلے سے۔ پانچ سال جو اس نے ولایت گزارے تھے۔ انگریزوں کا اٹھنا بیٹھنا اس نے کافی سیکھ لیا تھا۔ دیسی زبان وہ اب کم کم ہی بولتا تھا' اور کبھی بولنا پڑے' تو یوں بولتا تھا' جیسے کوئی گورا بولتا ہو۔

تھوڑے الفاظ منہ سے نکالتا اور جبڑے نکالتا ان کو منہ ٹیڑھا کر کے بولتا۔ انگریزی بہت اچھی بولتا تھا' اور انگریزی بھی وہ جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں نکھاری گئی تھی۔ باتیں کرنے کا بڑا شوقین تھا' اور کسی بھی پڑھے لکھے انگریز کی طرح ہر موضوع پر بات کر سکتا تھا' چاہے بات کتابوں بابت ہو' چاہے سیاست بابت اور چاہے کسی خاص آدمی بابت۔ کئی بار اس نے انگریزوں کے منہ سے بھی سنا تھا کہ اس کی انگریزی بالکل فرنگیوں کی طرح تھی۔

سر موہن لال کو ڈر تھا کہ کہیں اس کو اکیلے ہی سفر نہ کرنا پڑے۔ لیکن یہ تو ایک چھاؤنی تھی اور یہاں سے ضرور کوئی انگریز افسر سوار ہو رہا ہو گا۔ اس خیال سے کہ کوئی باتیں کرنے والا اچھا ساتھ ملے گا' اس کا دل خوش ہو گیا۔ باقی دیسیوں کی طرح کسی انگریز کے ساتھ باتیں کرنے کے لئے کبھی جلد بازی نہیں کرتا تھا' اور نہ ہی وہ طویل بحثوں میں پڑتا تھا۔ نہ ہی فضول ضدیں پکڑ کر بیٹھ جاتا تھا۔ اپنے کام کو ہمیشہ وہ ٹھنڈے مزاج سے کرتا۔ ہمیشہ وہ کوئی انگریزی اخبار لے کر ایک طرف بیٹھ جاتا۔ ہمیشہ ہی وہ اخباروں کو اس طرح بند کرتا کہ اخبار کا نام دوسرے کو دکھائی دیتا رہے۔ انگریزی اخبار اکثر انگریزی لوگ پڑھنے کے لئے مانگ لیتے' یا پھر کئی لوگوں کو اس کی ولایتی نکٹائی سے اس کے کالج کا علم ہو جاتا۔ پھر ولایت کی یونیورسٹیوں' وہاں کے اساتذہ' وہاں کی لائبریریوں' گھاس کے میدانوں کا ذکر چھڑ جاتا۔ اور اگر نہ کوئی اس کی نکٹائی کا خیال کرتا اور نہ کوئی اس کے انگریزی اخبار کی پرواہ کرتا تو سر موہن لال "کوئی ہے" کہہ کر بیرے سے وہسکی منگوا لیتا۔ وہسکی کا انگریزی ساتھیوں پر ضرور اثر پڑ جاتا' اور فوراً دوستی بن جاتی۔ اور پھر سر موہن لال اپنے سونے کے سگریٹ کیس میں سے غیر ملکی سگریٹ نکالتا۔ ہندوستان میں غیر ملکی سگریٹ! یہ اس نے کہاں سے خریدے تھے؟ اور پھر اپنے ساتھیوں کو وہ اپنے سگریٹ پینے کے لئے دیتا اور یہ دوستی مزید پختہ ہو جاتی۔ پھر وہ انگریزوں کے ساتھ اپنے پیارے ولایت کی باتیں شروع کر دیتا۔ وہ پانچ سال! قسم قسم کے سوٹ پہننے' انگریزی کھیل کھیلنے' لڑکوں کے ساتھ' لڑکیوں کے ساتھ' انگریزی دعوتیں اڑانیں' اور پھر انگریزی طوائفوں کے بازار کی سیریں۔ ان پانچ سالوں کی شاندار رنگین زندگی۔ ان پانچ سالوں کی زندگی سے بندہ پینتالیس سال کی زندگی وار دے۔ یہ دیسی زندگی! اس زندگی کی گندگی' کمینگی' جہالت۔ یہ زندگی بچھی کے ساتھ گزارنا پڑتی

تھی۔ پچھی جس کے منہ سے ہمیشہ پیاز کی بو آتی رہتی۔

سر موہن لال ان ہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ بیرے نے آکر اس کو بتایا کہ اس کا سامان انجن کے ساتھ والے فرسٹ کلاس ڈبے میں لاکر رکھ دیا گیا تھا۔ سر موہن لال آرام سے اپنے ڈبے میں جا بیٹھا۔ یہ دیکھ کر اس کو افسوس ہوا' کہ ڈبہ خالی تھا۔ آخر اس نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے' وہی انگریزی اخبار' جس کو وہ کئی دفعہ پڑھ چکا تھا' نکال لیا۔

اور سر موہن لال باہر پلیٹ فارم پر دیکھنے لگا۔ سامنے دو گورے فوجیوں کو جگہ کی تلاش میں تیز تیز چلتے دیکھ کر اس کا چہرہ کھل کھل اٹھا۔ گوروں نے تھیلے کندھوں پر لٹکائے ہوئے تھے' اوز شراب کی مدہوشی میں ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ سر موہن لال نے سوچا' ان کو وہ اپنے ڈبے میں بٹھا لے گا۔ چاہے اس طرح کے فوجیوں کے پاس ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے ہی ہوتے ہیں' اس نے سوچا' وہ گارڈ کو سمجھا دے گا۔

آخر کار ایک گورا اس ڈبے کے قریب آیا' اور شیشے میں سے اندر دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ساتھی کو آواز دے کر بلا لیا۔

گورے ڈبے میں داخل ہوئے' انہوں نے سر موہن لال کو دیکھا اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں انہوں نے فیصلہ کیا کہ اس کالے آدمی کو باہر نکال دینا چاہئے۔

پھر ان میں سے ایک آنکھیں نکالتا ہوا سر موہن لال پر برس پڑا' "جانتا--- فوج--- ریزرو۔"

وہ تو ڈبہ فوجیوں کے لئے ریزرو تھا۔ اس ڈبے میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ کس طرح اس میں سوار ہو گیا تھا۔

سر موہن لال آکسفورڈ یونیورسٹی کے لہجے میں ان سے انگریزی میں بات کرنے لگا۔

فوجی تھوڑا سا حیران ہوئے۔ یہ تو انگریزی بولتا تھا۔ لیکن پھر انہوں نے نشے میں دھت دماغ کو کچھ سمجھ نہ آئی۔ اتنے میں گارڈ نے سبز جھنڈی ہلائی۔ گوروں نے کوئی حیل و حجت نہ کی' نہ دلیل' سر موہن لال کا سامان اٹھا کر باہر پھینکنا شروع کر دیا۔ پہلے سوٹ کیس' پھر تھرموس بوتل' پھر بستر اور پھر انگریزی اخبار۔ سر موہن لال غصے میں آگ بگولا ہو گیا تھا۔

انگریزی میں وہ ان کو برا بھلا کہنے لگا۔ گارڈ کو کہہ کر ان کو قید کروانے کی دھمکیاں دینے لگا۔

گورے ایک لمحہ کے لئے پھر حیران ہوئے۔ وہ تو واقعی انگریزی بولتا تھا۔

لیکن پھر ایک نے سر موہن لال کے منہ پر گھونسہ کھینچ مارا اور دوسرے نے دھکا مارتے ہوئے اس کو چلتی گاڑی سے باہر پھینک دیا۔ سر موہن لال جھک کر اپنے بستر پر جا پڑا۔

سر موہن لال کے منہ میں جیسے زبان نہیں تھی۔ وہ قریب سے گزر رہی گاڑی کی جل رہی بتیوں کو گھور رہا تھا۔ آخر اس نے سرخ بتی والا آخری ڈبہ دیکھا، جس میں سبز جھنڈی اٹھائے گارڈ کھڑا تھا۔

گارڈ کے ڈبے سے پہلے زنانہ انٹر کے ڈبے میں بچھی تھی۔ کھا کھا کر موٹی ہوئی بچھی۔ اس کے ناک کے لونگ کا موتی اسٹیشن کی بتیوں سے لشک رہا تھا۔ اس کا منہ پان کی پیک سے بھرا ہوا تھا، جو وہ کتنی دیر سے جمع کر رہی تھی کہ گاڑی روانہ ہو گی، تو وہ تھوکے گی۔ پلیٹ فارم کی روشنیاں ختم ہوئیں، تو شریمتی موہن لال نے پچکاری چھوڑی، جو تیر کی طرح ہوا میں اڑتی چلی گئی۔

# ناستک (ملحد)
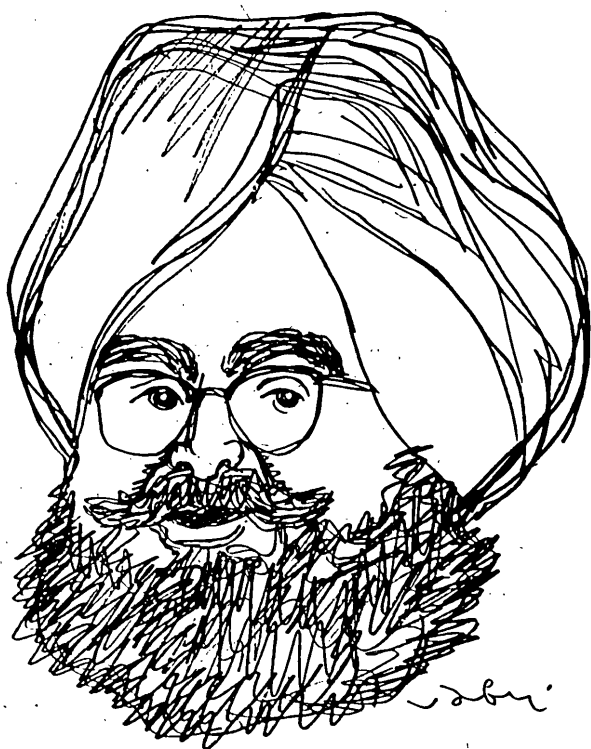
ہمیشہ کی طرح بحث کا رخ پھر اسی طرف مڑنے لگا "تو تم نہیں مانتے' کہ خدا ہے؟ یہ سب صرف بحث کے واسطے ہی کہتے ہو' کہ تمہیں خدا کی ہستی پر واقعی یقین نہیں ہے؟" میزبان نے پوچھا' اور لمبا سانس چھوڑتے ہوئے کہا' "خدا تمہارا بھلا کرے۔"

"نہیں' مہمان نے جواب دیا' "میں واقعی ہی خدا کو نہیں مانتا۔ میرا بھلا تو شیطان ہی کرے گا۔"

میزبان نے ذرا مشتعل ہوتے ہوئے اپنے بازو پھیلا کر پوچھا' "تو یہ سب کہاں سے آتا ہے؟ یہ درخت' یہ پودے' یہ انسان' یہ جانور' یہ دنیا اور اس دنیا میں یہ تمام ساری چیزیں؟ بولو؟" سیاستدان تھا' اس لئے زبان بازی تو اسے آتی ہی تھی۔ اس کے بیوی بچوں کی طرفداری بھی اسے حاصل تھی۔

"یہ تو میں نہیں جانتا۔" مہمان نے جواب دیا۔ وہ اس کا مذاق بنا پاتے' اس سے پہلے ہی وہ پھر بولا' "اور نہ ہی تم جانتے ہو! یہ تو کوئی پیغمبر' پیر' مسیحا' یا نبی بھی نہیں معلوم کر سکا۔ دنیا میں کوئی بھی نہیں جانتا۔ اور تمہارے یہ مذہب' دھرم--- یہ سب تو بچوں کی پری کہانیاں جیسے---"

اتنے میں ہی میزبان کا دس سالہ بیٹا اپنی عادت کے مطابق بحث میں حصہ لیتے ہوئے بولا' "میں جانتا ہوں۔ سب کچھ خدا کی طرف سے آتا ہے۔ اب بولئے!" مہمان کی ہنسی اڑاتے ہوئے اس کے منہ کے سامنے چٹکی بجاتے ہوئے وہ کہنے لگا' "سب کچھ خدا ہی ہے! خدا' خدا' خدا۔ اور اگر آپ شیطان کو مانتے ہیں' تو خدا کو بھی آپ کو ماننا

پڑے گا۔"

"کس نے کہا کہ میں شیطان کو مانتا ہوں؟ شیطان بھی تو انسانوں کے فتوری دماغوں کی ہی پیداوار ہے!" بچے کو سمجھانے کی خاطر اس نے مثال دی' "تمہارا خدا محض ایک گیس کے غبارے کی طرح ہے یا پھر اس سرخ ربڑ کی گیند کی طرح' جسے تم باغیچے میں اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے لڑکھڑاتے رہتے ہو۔"

گھر میں سب کے منہ اتر گئے۔ میزبان کی بیگم صاحبہ نے ٹوکا' "اوہ' پلیز' خدا کے واسطے ایسی کفر کی باتیں کر کے بچوں کا یقین مت توڑیں۔ میں پیسے دے کر مولوی صاحب کو بلواتی ہوں کہ ان کو قرآن شریف پڑھائیں' نماز ادا کرنا سکھائیں اور تم؟ تم تو میرے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہو۔"

بچوں کی طرف رخ کرتے ہوئے وہ بولی' "تم لوگ ان کی باتوں پر ذرا بھی غور مت کرنا۔ اب جاؤ' اپنا ہوم ورک ختم کرو۔ چلو! جاؤ!"

بچوں کا جانے کو ذرا بھی دل نہیں کر رہا تھا۔ بڑوں کی بحث میں انہیں بڑا مزہ آرہا تھا' لیکن امی کے پیار سے سمجھانے اور رشوت دے کر پھسلانے پر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چھوٹے والا جانے سے پہلے ہنستے ہوئے بولا' "گارڈ از اے ریڈ ربڑ بال۔" (خدا سرخ ربڑ کا گیند ہے۔)

بیگم صاحبہ نے شکایت بھرے لہجے میں کہا' "دیکھئے' آپ نے کیا کہا؟ اب یہ اپنے سکول میں جا کر بھی یہی بولے گا۔ کیتھولک سکول ہے۔ نکال باہر کریں گے وہ بچے کو! اب یہ بچے رمضان شریف میں روزہ نہیں رکھیں گے۔ نماز پڑھنے سے بھی منع کریں گے۔ ان کا یقین خدا سے ہٹ جائے گا۔ دکھ تکلیف میں پھر بھلا کس کے سہارے کو جھکیں گے یہ لوگ؟ آپ کیا چاہتے ہیں کہ یہ دنیا میں رہنے کے لائق نہ رہیں؟ مس فٹ اور سب سے الگ تھلگ رہ جائیں؟"

مہمان اب بھی انہیں بھڑکاتا رہا' "تب تو تمہیں اپنے بچوں کو مجھ جیسے لوگوں سے ملنے نہیں دینا چاہئے۔ اپنے گھر اب مجھے کبھی مت بلانا۔ بس' اپنے مولوی صاحب کو بلاؤ۔ سکول کے کیتھولک فادروں کو بلاؤ اور دقیانوسی انکل آنٹیوں کو بلاؤ' تاکہ وہ ان کے دماغوں میں یہی سب بھریں--- اوپر والا اور آدم و حوا' قیامت اور دوسرا جنم' نجات اور سنیاس--- لوکے!"

"اچھا' اچھا' زیادہ گرم ہونے کی ضرورت نہیں۔" میزبان نے بات ٹالنے کی غرض سے کہا' "چلو' تھوڑا ٹہل آئیں۔ تم دونوں کے دماغ بھی ٹھنڈے ہو جائیں گے۔"

وہ باغیچے میں ٹہلنے لگے۔ مہمان پھر سے بیگم صاحبہ سے صلح کرنے کی کوشش میں لگا تھا' "ہماری بحث ہمیشہ یہی رخ اختیار کر لیتی ہے۔ نہیں؟ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ دیکھو خلیل جبران نے کہا تھا:۔

"جب میں چھوٹا تھا'<br>
اسے (خدا کو) جاننے کے تجسس میں'<br>
خدا پرستوں کے پاس گیا'<br>
مفکروں کے پاس گیا'<br>
اس کے (خدا کے) بارے میں'<br>
ان کے دلائل سنتا رہا۔<br>
لیکن جتنی بھی بار گیا۔<br>
اسی دروازے سے واپس لوٹ آیا'<br>
جس سے اندر گیا تھا۔"

"ہو سکتا ہے۔" وہ تہذیب سے بولی' "لیکن میں اب بھی اپنی بات کو صحیح مانتی ہوں۔ یہ کس نے فقرہ کہا تھا کہ "میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہ گھڑی یہاں ہے' لیکن اس کو بنانے والا کوئی نہیں ہے؟""

"والٹیئر نے۔ ہاں' یہ بات الگ ہے کہ کچھ ہندو اور سکھ اسے "مایا" کی طرح چھرم مانتے ہیں' لیکن دنیا کو بنانے والے کے بارے ہم کچھ نہیں جانتے' یہ تو طے شدہ ہے۔ اگر یہ مان بھی لیں کہ دنیا کا کوئی خالق ہے' تو بھی اس کی عبادت کرنے کی' اس کی پوجا کرنے کی تو کوئی تک نہیں بنتی۔ ویسے بھی دنیا میں اچھائیوں کی بجائے خرابیاں زیادہ ہیں' اس لئے خاموش رہنا ہی ٹھیک ہے۔ یہ خدا کے وجود کا معاملہ ہی ایسا ہے' جس کی کنجی ابھی تک کسی کے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ یہ ایک ایسا پردہ ہے' جس کو ہٹا کر اس کے پیچھے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ ہمیں نہیں معلوم' زیادہ ایمانداری کی بات ہو گی' نسبتاً" ایسے اعتقادات کو سچ قرار دینا' جو بحث اور دلیلوں کے بالکل الٹ ہوں۔ میں نہ تو یہ جانتا ہوں کہ خدا ہے اور نہ ہی یہ کہ خدا نہیں ہے' اس لئے میں اپنے آپ کو

ناستک کہتا ہوں۔"

"یقیناً" یقیناً"۔" میزبان نے عاجزانہ تسلیم کر لیا، "بھئی، تم نہیں مانتے تو تمہاری مرضی، ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن جو مانتے ہیں، انہیں تو ماننے دو، جب تک کہ یہ پوری طرح ثابت نہیں ہو جاتا کہ ان کے اعتقادات غلط ہیں۔ کیوں؟ جیو اور جینے دو۔ اب چلو کوئی اور بات کریں۔"

لیکن مہمان اب بھی ضد پر قائم رہا، "جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا، وہ ہے، دھرم کی سنک اور شعبدے باز سنت سادھوں کی اندھی پوجا۔ آخر کیا ہے یہ سادھو سنت؟ مداریوں کی طرح کرتب دکھلا کر ایشور، آتما، پریم اور معلوم نہیں کن کن اصولوں کو گڑتے رہتے ہیں اور لوگ بیوقوفوں کی طرح ان کو تسلیم بھی کر لیتے ہیں۔"

"ہم لوگ خدا کی بات کر رہے تھے، شعبدے باز، سادھوں کی نہیں۔" بیگم صاحبہ نے پھر ٹوکا، "مجھے تو یہ حیرانی ہو رہی ہے، کہ جس انسان کو قدرتی طاقتوں--- دیوی قوتوں سے اتنی نفرت ہو، وہ ہمیشہ ہی خدا کی باتیں کیوں کرتا رہتا ہے؟ تم ہی بات چھوڑتے ہو اور بڑھاتے بھی ہو، جیسے دانت کے درد سے بے حال آدمی بار بار اپنے درد کرتے دانت کو زبان سے چھو چھو کر اور درد بڑھاتا رہے۔ ہو سکتا ہے، تمہاری اس مخالفت کے پیچھے تمہارے اعتقاد کی بات ہی پوشیدہ ہو، جس کو تم تسلیم کرنا ہی نہیں چاہتے۔ اندھیرے میں خوف کھاتا ہوا آدمی جیسے چلا چلا کر اپنے آپ کو ہی تسلی دیتا رہے، کہ کوئی بات نہیں ہے۔"

"یہ بات درست ہے، بھئی۔" میزبان نے حامی بھری۔ "مجھے فرانس تھامپسن کی کچھ سطریں یاد آ رہی ہیں---"

"میں رات دن اس سے (خدا سے) دور بھاگتا رہا،
وقت کے محرابوں میں اس سے بھاگتا رہا،
اپنے ہی دل کو بھول بھلیوں میں اس سے بھاگتا رہا،
اپنے آنسوؤں میں اور ہنسی میں،
اس سے چھپتا رہا۔
لیکن، اس کے (خدا کے) پاؤں،
آرام سے، بغیر رکے،

سدھی ہوئی چال سے' قدرتی قربت کے ساتھ'
میرا پیچھا کرتے رہے۔
پاؤں کی رفتار سے بھی تیز'
ایک آواز مجھے کہتی رہی۔۔۔۔
"جو مجھے دغا دیتا ہے' اسے تمام چیزیں دغا دے سکتی ہیں۔"
"اسی طرح ایک نہ ایک دن وہ (خدا) تم تک پہنچ ہی جائے گا' چاہے ہی تم اسے لاکھ ربڑ کی گیند کہہ کر اس کی اہانت کرو۔"

رات کے کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ لوگ گھر لوٹ آئے۔ بیگم نے تالی بجا کر بچوں کو پکارا' "بچو' میز پر آؤ۔" جیسے ہی سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے' اس نے بچوں کی پلیٹیں کھانے سے بھر دیں۔ چھوٹا لڑکا کھلکھلا کر ہنسنے لگا' "گاڈ از اے ریڈ ربڑ بال!"

بیگم صاحبہ نے بچے کی توجہ ہٹانے کے لئے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی' "چلو' اب کل کے بارے پروگرام بنائیں۔"

"گیس والا بیلون! نہیں میرا ریڈ ربڑ بال!" بچہ پھر ہنسا۔

"اب بس کرو۔" بیگم نے اسے ڈانٹ کر کہا' "ایک حرف بھی اور بولا' تو دیکھنا مجھے غصہ آجائے گا۔"

اس رات میز پر خدا کے بارے اور کوئی بات نہیں ہوئی۔ لیکن دوسرے دن ناشتے کے وقت بچوں کا پھر دل کر رہا تھا کہ امی ابا اور مہمان خدا کے بارے پھر سے بحث شروع کریں۔ ننھے لڑکے نے اپنا ربڑ کا سرخ گیند مہمان کی گود میں رکھ کر معنی خیز طریقے سے کہا' "تم اس کو لے لو۔" اس کی امی نے اس کی طرف گھورا' یاد رکھنا' اگر پھر وہی باتیں شروع کیں' تو کل کا پکنک کا پروگرام رد کر دوں گی! سمجھے!"

اتوار کا دن تھا۔ آخری بارشوں کا موسم۔ اوپر تیرتے بادلوں کے سیاہ سائے زمین پر پڑ رہے تھے۔ بادل کبھی اچانک ہی برس پڑتے اور کبھی کبھی برستے میں ہی سورج چمک اٹھتا اور آسمان میں قوس قزاح کے رنگوں کی روشنی بکھر جاتی۔ بیگم صاحبہ نے چہک کر کہا' "پارک میں پکنک منانے کے لئے بڑا ہی پیارا دن ہے۔"

انہوں نے موٹر کار پارک کی طرف بڑھائی۔ بچے اپنے ساتھ اپنا ربڑ والا گیند لے آئے تھے۔ وہ کبھی ایک دوسرے پر گیند پھینکتے اور کبھی پیڑوں کے اوپر گیند کو اچھال کر

واپس پکڑنے کی کوشش کرتے۔ میزبان اور بیگم صاحبہ مہمان کو نیا "روز گارڈن" دکھا رہے تھے۔

چلتے چلتے وہ پیپل کے ایک بہت بڑے درخت کے پاس رکے۔ بڑے لڑکے نے گیند کو درخت کے اوپر اچھالا۔ گیند درخت کے اوپر اٹھی اور ایک شاخ سے اچھلتی ہوئی دوسری شاخ پر اچھلی۔ بچے گیند کو لپکنے کے لئے ہاتھ پھیلائے کھڑے تھے۔ گیند سب سے نچلی شاخ پر آکر دوبارہ اچھلی' نیچے آئی اور دوبارہ اچھل کر درخت کی ایک دوشاخہ کی ٹہنی پر جا پھنسی۔ "اوہ' ہو' گیند تو درخت میں اٹک گئی!"

آدھے گھنٹے تک وہ ٹہنیاں اور کنکر پھینک پھینک کر گیند کو نیچے لانے کی کوشش کرتے رہے۔ میزبان اب مزید برداشت نہ کر سکا۔ اس نے بچوں کو جھڑکا' "اب سارا دن گیند کو نیچے لانے میں تو نہیں لگا دینا ہے نا؟ چلو' چل کر کچھ ٹھنڈا ٹھنڈا پیئیں۔"

بچے بے دلی سے چل پڑے۔ کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل تو گیند میں الجھا ہوا تھا۔ "کولڈ ڈرنک" کے اسٹینڈ پر گئے۔ ٹھنڈی بوتلیں پیئیں' لیکن مزہ نہ آیا۔ امی نے سمجھایا بھی' "ارے بابا' صرف ربڑ کی گیند ہی تو تھی' ایسے کیوں دیکھ رہے ہو کہ قیامت ہی ٹوٹ پڑی دنیا پر؟ اور خرید دوں گی۔"

پھر بھی بچوں کا موڈ نہیں بدلا۔ آلو چپس کی پلیٹیں اور ٹماٹر کی ساس' آئس کریم--- سب کھلایا' لیکن کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ گھنٹے بھر بعد وہ سب پارک سے ہوتے ہوئے اپنی موٹر گاڑی کی طرف لوٹنے لگے۔

پیپل کے درخت کے پاس پہنچ کر رکے۔ دیکھا' سرخ گیند درخت کی شاخوں میں اب بھی ویسے ہی پھنسی ہوئی تھی۔ سب نے اوپر دیکھا' "اب بھی وہیں ہے۔" اب کی دفعہ کسی نے اسے نیچے گرانے کی کوشش نہیں کی۔

مہمان انہیں خوش کرنا چاہتا تھا۔ اس نے زور سے اعلان کیا' "آل رائٹ' اگر یہ ربڑ کی گیند گر کر میرے ہاتھوں میں آپڑے' تو میں مان لوں گا کہ خدا ہے۔"

ہوا کا ایک ہلکا جھونکا آیا اور درخت کی شاخوں کو ہلا گیا۔ ربڑ کی سرخ گیند سیدھی آکر مہمان کے ہاتھوں میں گری۔

وہ سب حیرت سے آنکھیں پھاڑے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

"چلو' تمہیں اچھا سبق ملا۔" بیگم صاحبہ نے طنزیہ بھری چٹکی بھری۔

"ڈیم!" ناستک اور کیا کہتا؟
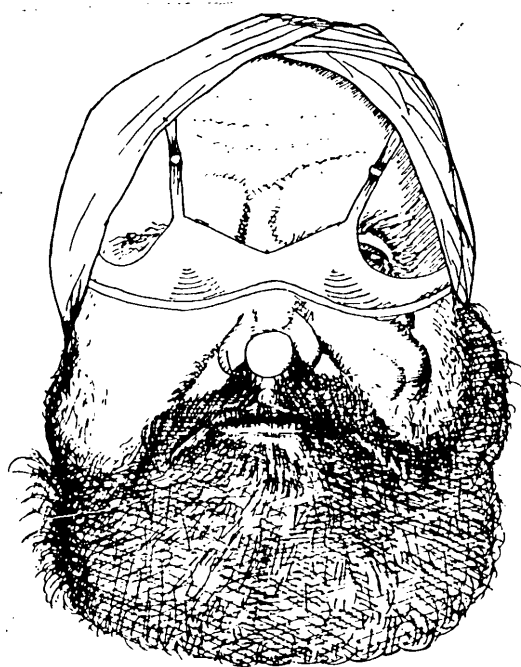
# صاحب کی بیوی

"ہاں، تو کہئے، میں آپ لوگوں کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" پائپ کی نلی میں کلینز گھسا کر اسے صاف کرتے ہوئے مسٹر سین نے نظریں ملائے بغیر ہی نو واردوں سے پوچھا۔ کریدے ہوئے کوڑے کو پھونک مار کر اڑانے لگے، تو وہ لوگوں کے ہاتھوں میں لٹکتے گیندے کے گلابی پھولوں کے ہاروں پر پڑا۔ اچھا، تو انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ آج صبح ہی وہ شادی کے بندھن میں بندھے تھے۔ اپنی طرف سے تو انہوں نے اسے مکمل طور سے خفیہ رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن اپنے اس ملک میں بھلا کسی بھی راز کو کبھی چھپایا جا سکتا ہے۔

پائپ کی نلی کو پائپ کے "باؤل" میں جوڑ کر انہوں نے اس میں دوبارہ پھونک ماری، اور نیچی نظروں سے ہی دیکھا کہ نو وارد ذرا مضطرب سے ہونے لگے ہیں۔ پلاسٹک کی چھوٹی سی تمباکو کی تھیلی کھول کر وہ اپنا پائپ بھرنے میں لگے رہے۔ نو واردوں میں کچھ دیر بھسبھساہٹ سی ہوتی رہی۔ پھر ان میں سے ایک نے کچھ کہنے کے لئے اپنا گلا صاف کیا۔

"ہاں تو، مسٹر بینرجی، کیا پریشانی ہے آپ کو؟" سین صاحب نے اسی بے کیف لہجے میں پوچھا۔

"سر،" بابو طبقے کے سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا، "بی کیم ٹو بش ریور گٹ شیلف لانگ لائف اینڈ ہیپی نیش!" (سر، ہم آپ سب کو درازی عمر اور ہمیشہ سکھی رہنے کی نیک خواہشات دینے آئے ہیں۔) اس نے چپڑاسیوں کو حکم دیا کہ صاحب کے گلے میں

پھولوں کے ہار ڈال دیئے جائیں۔

چپڑاسی پھولوں کے ہار لے کر آگے بڑھے ہی تھے کہ صاحب نے انہیں التجا نہ روکتے ہوئے حکم دیا' "میز پر رکھ دو' آن دی ٹیبل۔" چپڑاسیوں کے ہاتھ وہیں تھم گئے۔ مسکرانا بھول کر وہ کھسیانہ ہنسی ہنستے ہوئے پھولوں کے ہاروں کو میز پر رکھ کر بابوؤں کی قطار کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔

"بس' یہی بات تھی؟" مسٹر سین اٹھ کر کھڑے ہو گئے' "تب کام پر واپس چلا جائیے' اور ہاں' آپ سب کی نیک خواہشات کے لئے میرا بہت بہت شکریہ!" لوگ سمجھ گئے کہ صاحب کا اشارہ رخصت لینے کا ہے۔

"بینر جی' تم ذرا تھوڑی دیر بعد پھر آنا۔ میں کچھ دنوں کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ کام کے "رڈسٹریبیوشن" (دوبارہ تقسیم) کے لئے تم سے کچھ مشورہ کرنا تھا۔"

"شرٹنی' سر!"

ہاتھ جوڑ کر نمستے کر کے وہ سب آہستہ آہستہ باہر نکل گئے۔

پائپ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے چھلوں میں چھت کی طرف اٹھتے ہوئے دیکھتے دیکھتے سین پھر خیالوں میں کھونے لگے۔ ان کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا تھا۔ ہندوؤں کے لئے شادی کا یہی مطلب ہے--- ویدوں کے مطابق زندگی کی چار حالتوں میں سے ایک حالت۔ انہیں خود ہی حیرانی ہوئی کہ وہ سوچتے سوچتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں۔ وہ سوچ رہے تھے کہ ہندوؤں کی زندگی کا کوئی بھی شعبہ مذہب کے لمس سے اچھوتا کیوں نہیں ہے۔ لیکن ان کے والد خیالات سے کوئی خاص قدامت پرست نہیں تھے۔ ہندو ہوتے ہوئے بھی انہوں نے انہیں اینگلو انڈین اسکول میں داخل کرایا تھا۔ جہاں لڑکوں نے ان کا نام سنتوش سے بدل کر "سین" رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد وہ "ولایت" چلے گئے۔ آزادی سے پہلے ہی بھارتی انتظامیہ سروس میں لگ گئے تھے۔ یہ تو بعد میں آزاد ہندوستان کی سرکار نے قومی جذبات کے تحت ہندی اور ایک مادری زبان کو پڑھنا لازمی قرار دے دیا تھا۔ لیکن ہندوستانی زبانوں کے بارے ان کی لاعلمی کسی طرح بھی رکاوٹ کا باعث نہ بنی۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ اس کی آڑ لے کر دوسروں کو متاثر ہی کرتے تھے۔ اپنے لہجے اور چال ڈھال کے باعث وہ لوگوں میں آسانی سے گھل مل نہیں پاتے تھے۔ لیکن ایک طرح سے اچھا ہی تھا--- وہ ان لوگوں کی طرح حسد'

نفرت، جلن اور چغلی وغیرہ کے رجحانات سے محفوظ تھے۔ پھر بھی لوگ ان کا ساتھ پسند کرتے تھے، کیونکہ وہ ہندوستانی ہوتے ہوئے بھی ہندوستانیوں کی طرح نہیں تھے۔ وہ تھے ایک براؤن برٹش جنٹلمین!

اپنے ملک سے سین کو اگر کسی وجہ سے کوئی لگاؤ تھا، تو وہ تھا اپنی ماں کی وجہ سے۔ بے چاری بیوہ تھی۔ روایات کے مطابق اس نے اپنے سر کے بال منڈوا دیئے تھے۔ صرف سفید دھوتی پہنتی اور ننگے پاؤں چلتی۔ وہ اس کی ایک محض اولاد تھے۔ جو بھی بن پاتا، دونوں ماں بیٹے ایک دوسرے کے لئے کرتے تھے۔ ماں ہی ان کا گھر سنبھالتی تھی۔ زیادہ تر تو وہ بیرے کے بنائے "لیمب چوپس" اور "شیفرڈس پائی" ہی کھاتے تھے، لیکن کبھی کبھی ماں کا دل رکھنے کے لئے اس کے ہاتھ کا پکایا بھات، ماچھ اور مشٹی بھی کھا لیتے۔ گھر کے ایک کمرے کو ماں نے مندر میں تبدیل کر رکھا تھا، جہاں وہ دھوپ اگر بتی جلا کر گھنٹیوں کی مدھر آواز کے درمیان کالی ماں کی پوجا کیا کرتی تھی۔ لیکن اس نے انہیں کبھی پوجا کرنے کے لئے پابند نہیں کیا۔ اسی طرح وہ خود ہندوستانی فلمیں دیکھنا بالکل پسند نہیں کرتے تھے، لیکن ماں کو مہینے میں ایک فلم ضرور دکھلاتے تھے۔ ماں بھی شام کو ان کے اسکاچ پینے کا یا اپنی موجودگی میں سگریٹ پینے کا برا نہیں مانتی تھی۔ نہ ہی کبھی پوچھتی کہ وہ کہاں آتے جاتے تھے، کیا کرتے تھے۔ جب تک ماں نے ان کی شادی کی بات نہیں چھیڑی تھی، ان دونوں کی خاصی نبھ رہی تھی۔

پہلے تو وہ مذاق میں بات ٹالتے رہے، لیکن آہستہ آہستہ ماں کا اصرار بڑھتا رہا۔ یہ چاہتی تھی کہ اب انہیں اپنی زندگی میں بہتر طور سے منظم ہو جانا چاہئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے ان سے کہا، کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے پوتے کو گود میں کھلانا چاہتی ہے۔ آخر کار انہیں ہار ماننی ہی پڑی۔ شادی کے متعلق ان کی کوئی خاص سوچ نہیں تھی۔ لڑکی کیسی ہو؟ یہ بھی انہوں نے نہیں بتایا۔ ملک میں لوٹ آنے کے بعد اس سے برا اور کیا ہو سکتا تھا کہ اپنی ذات برادری میں شادی کرنی پڑے۔ انہوں نے ماں سے کہا، "ٹھیک ہے ماں، تم میرے لئے بیوی ڈھونڈو۔ جو بھی لڑکی تمہیں پسند ہو گی، میں اس سے شادی کر لوں گا۔"

ماں نے کئی دنوں تک بات نہیں چھیڑی۔ پھر ایک دن اس نے ڈیرہ دون سے اپنے بھائی کو بلایا۔ دونوں نے مل کر ایک شادی کا اشتہار تیار کیا اور "ہندوستان ٹائمز"

سنڈے ایڈیشن میں شائع ہونے کے لئے دے دیا۔ ہندی میں ترجمہ کریں' تو اشتہار اس طرح تھا:۔

"آکسفورڈ تعلیم یافتہ' فرسٹ کلاس گزیٹیڈ سرکاری افسر' ماہوار تنخواہ 1000/ روپے' بنگالی' عمر 25 سال کے لئے اعلیٰ طبقے' معزز خاندان کی گوری' خوبصورت لڑکی چاہیے۔ ذات اور جہیز کی قید نہیں۔ جنم کنڈلی کے ساتھ خط و کتابت کریں۔ پی۔ او بکس نمبر4200-"

پہلے ہفتے کے اشتہار کے جواب میں تقریباً" پچاس خطوط آئے۔ لڑکیوں کی تصویروں کے ساتھ ساتھ جنم کنڈلیاں بھی تھیں۔ دوسرے ہفتے کے اشتہار کے بعد خطوط کو چھانٹا گیا اور بڑے شوق سے "سنی" کی ماں اور ماما نے تقریباً" سو فوٹو گراف کھانے کی لمبی چوڑی میز پر پھیلا دیئے۔ لڑکیاں کنواری تھیں اور گھر کے کاموں میں ماہر تھیں۔ ماں باپ نے لکھا تھا تو ماننا ہی پڑ رہا تھا۔ لیکن ذات اور جہیز کی قید نہ ماننے کے باوجود وہی لڑکیاں پسند کی گئیں' جو ان کی ذات کی تھیں اور جن کے والدین نے لمبا چوڑا جہیز دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اب فیصلہ "سنی" کے ہاتھوں میں تھا۔

"سنی" کو پہلی بار معلوم ہو کہ اس کی شادی کے لئے اخبار میں اشتہار دیا گیا تھا۔ وہ بہت تذبذب میں پڑ گئے۔ ان کی شرمندگی کا ٹھکانہ نہ رہا' جب کلکتہ جیسی دور دراز کی جگہوں سے چل کر لڑکی والے اخبار کے دفتر سے ان کا ایڈریس لے کر دفتر میں ہی انہیں دیکھنے چلے آئے۔ انہوں نے ماں سے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر یہ سب تماشہ بند نہ ہوا' تو وہ کوئی شادی وغیرہ نہیں کریں گے۔ تو ماں اور ماما نے جلدی جلدی سارا معاملہ نپٹا دیا۔ لڑکی وہ پسند کی گئی' جس کے والد نے سب سے بھاری بھر کم جہیز دینے کا وعدہ کیا۔ سگائی میں ہی لڑکی کے والد نے شادی میں دی جانے والی رقم کا ایک بڑا حصہ انہیں تھما دیا۔ دونوں فریقین لڑکے لڑکی کی جنم کنڈلی لے کر پنڈت کے پاس گئے۔ ہتھیلی گرم ہوتے ہی اس نے اعلان کر دیا کہ لڑکا لڑکی ایک دوسرے کے بالکل قابل ہیں۔ دونوں فریقین کے لئے مناسب مبارک تاریخ بھی پنڈت نے نکال دی۔

اس سے زیادہ برداشت کرنا اب "سنی" کی برداشت سے باہر تھا۔ انہوں نے منہ پھٹ ہو کر کہہ دیا کہ شادی کریں گے' تو کورٹ میں رجسٹری سے ورنہ نہیں۔ ماں اور ماما کے پاس ہتھیار ڈالنے کے سوا اب اور کوئی چارا نہیں تھا۔ لڑکی والوں نے تھوڑا

بہت اصرار کیا۔ رسم و رواج کے مطابق شادی ہو' تو برات کی خاطر مدارات ہوتی ہے' دعوتیں جشن ہوتے ہیں۔ تحفے تحائف دیئے لئے جاتے ہیں' پنڈت بیٹھتا ہے۔ ہزاروں روپوں کا لین دین ہوتا ہے۔ یہ بھی کوئی شادی ہوئی بھلا؟ رجسٹرار کی فیس--- پانچ روپے!

لیکن ایسے ہی تھے' مسٹر سنتوش سین اور کماری کلیانی داس کی یہ شادی۔ کلیانی مسٹر پروفلوا داس اور مسز پر یتما داس کی پانچ لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ مسٹر داس بھی اپنے داماد سنتوش سین کی طرح ہی ایک فرسٹ کلاس گزیٹیڈ سرکاری افسر تھے۔

ہنی مون کے نام پر بھی مشکلات آئیں۔ ماں تو شرم سے ایسی سرخ ہوئی جا رہی تھی' جیسے "سنی" نے کچھ نامناسب کہہ دیا ہو۔ داس صاحب اور ان کے گھر والے بھی پریشان تھے کہ لڑکی ہی لڑکے کے ساتھ پندرہ دنوں تک باہر کیسے رہے گی! لیکن ہار کر انہوں نے اسے اس کی قسمت کے سہارے چھوڑ دیا۔ اس کا خاوند صاحبوں کی طرح پلا بڑھا تھا' اس لئے اسے بھی اس کے نقش قدم پر چلنا چاہئے۔

سین کی نیند ٹوٹی' جب اس کا ہم مرتبہ سنتا سنگھ کمرے میں داخل ہوا۔ اپنی برادری کی ساکھ کے مطابق یہ سردار جی بھی اونچا بولنے والا اور ذرا دھاڑک قسم کا تھا۔ "ارے بھائی' تم کیا سوچتے ہو' کہ بغیر پارٹی وغیرہ کے ہم تمہیں چھوڑ دیں گے؟ اپنی بھابھی کے استقبال میں پارٹی لے کر ہی رہیں گے۔" داخل ہوتے ہی وہ چلایا۔

سین اٹھا اور سردار جی کو دور ہی رکھنے کی فکر میں میز پر ہاتھ ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ سنتا سنگھ نے اس کی کوششوں کو نظر انداز کرکے میز کے پار جاکر دوست کو گلے لگا لیا اور اس کے گالوں کو اپنے مونچھوں والے ہونٹوں سے چوم لیا' "بدھائی ہو بھائی' بدھائی ہو۔ بھابھی سے کب ملا رہے ہو' یار؟"

"بہت جلدی۔" سین نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرکے اپنے گالوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔ لیکن جلدی ہی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا' "جیسے ہی ہنی مون سے لوٹ کر آتے ہیں' نا' تمہیں اس سے ملائیں گے۔"

"ہنی مون!" سنتا سنگھ نے طنز کرتے ہوئے کہا اور سین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر معنی خیز انداز میں دبایا' "ارے بھئی' چمیلی کے تیل سے مالش وغیرہ کروائی ہے کہ نہیں؟ اور ذرا دودھ میں بادام وغیرہ ڈال کر پینا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ بھابھی کو

زیادہ۔۔۔۔" سردار جی کے بن مانگے مشوروں اور ہدایات کا کوئی آرپار ہی نہیں تھا' کہ کس طرح نئی دلہن کے پاس جانا چاہئے' اور شہوت بڑھانے والی چیزوں کا استعمال کیسے کرنا چاہئے۔ بغیر کوئی تبصرہ کئے سین خاموشی اور انکساری سے سنتے رہے۔ جب حد ہو گئی' تو انہیں ہاتھ بڑھا کر روکنا ہی پڑا' "بڑی مہربانی' آپ نے درشن دیئے۔ ہنی مون سے لوٹتے ہی ہم دونوں آپ کو اور مسز سنگھ کو ملنے آئیں گے۔"

سنتا سنگھ کا منہ لٹک گیا۔ سین کے بڑھے ہوئے ہاتھ سے ہاتھ ملا کر بولا' "گڈ بائی! ہیو اے نائس ٹائم!"

سین نے چین کا سانس لیا۔ وہ جانتے تھے کہ انہوں نے کسی طرح کی بھی بدتہذیبی نہیں کی تھی۔ صرف وہی کیا تھا' جو ان کی صورت حال میں کوئی بھی مہذب انگریز کرتا۔

ایک منٹ بعد ہی ڈیپارٹمنٹ کے ڈائریکٹر مسٹر سوامی کو اندر آنے کے لئے چپڑاسی نے پردہ ہٹایا۔ سین نے دوبارہ نووارد کو دور رکھنے کی کوشش میں میز سے ہی اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ گلے ملنے کا خیال ہی انہیں بے چین کر دیتا تھا۔

"گڈ مارننگ سر!"

ڈائریکٹر نے منہ سے جواب دیئے بغیر ہی اپنا ہاتھ سین کے ہاتھ سے چھوا دیا۔ منہ میں پان کی پیک بھری ہوئی تھی۔ منہ اوپر کر کے پیک سنبھالی اور چپڑاسی کو آواز دی' اے' پیک دان لاؤ۔"

سین نے چپڑاسی سے کہہ کر پیک دان اپنے کمرے سے ہٹوایا ہوا تھا۔ اس لئے باہر سے پیک دان لاکر چپڑاسی نے ان کے منہ کے نیچے لگا دیا۔ مسٹر سوامی نے پچ سے تھوکا' تو سین میز کا دراز کھول کر ماچس ڈھونڈنے کی اداکاری کرنے لگے' جیسے اس کا تھوکنا انہوں نے دیکھا ہی نہ ہو۔ ڈائریکٹر صاحب آرام سے سامنے والی کرسی میں جم گئے' "اوہ' یو سین' یو آر اے ڈارک ہارس (ہنسی)۔ بائی گاڈ' اے پچ بلیک ہارس' اف آئی مے سے سو۔" مسٹر سوامی کو اپنے انگریزی محاوروں پر بڑا ناز تھا' "تو بھائی' تم چپ چاپ جاکر شادی بنا لیا؟ ہے؟ اور میرا سٹینو آج سویرے میں آکر بولا جی' "ہم لوگوں کو صاحب کا میرج کا خوشی میں چھٹی منانا مانگتا۔" ہم پوچھا۔۔۔۔ "مین' کون میرج؟ کس کا شادی؟" تو وہ بولا' "صاحب' سین صاحب آج سویرے میں شادی بنایا۔" "بائی گاڈ۔"

ہم بولا' "پتہ لگانے کو ہے کہ سچا بات کیا ہے؟ آئی مسٹ گیٹ دا ٹتھ اینڈ نتھنگ بٹ دا ٹتھ' رائٹ فرام دا ہارسز ماؤتھ۔"

ڈائریکٹر صاحب نے پھر میز کے پار اپنا ہاتھ بڑھایا' "تم بہت ہوشیار آدمی ہے۔" وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔ سین نے اپنے باس کا ہاتھ انگلیوں کے پوروں سے چھوا اور کہا' "تھینک یو' سر!"

"ارے' تھینک یو کیسا؟ شادی والا دن بھی تم دفتر چلا آیا۔ دنیا ختم ہو جائے گا' نہ کیا' اگر جے تم تھوڑا دن واسطے چھٹی لے لے گا تو؟ ہم تم کو باس کا روپ میں آرڈر دیتا ہے' جے ابھی گھر چلا جاؤ۔ اپنا وائف کا پاس۔ ہم ابھی ایک ڈیپی آفشل میمو کاٹتا ہے۔ دیکھیں تم کیا کرتا ہے تب؟" ڈائریکٹر نے اپنے آپ سے مطمئن ہو کر ہاتھ سین کی طرف بڑھایا۔

سین نے باس کی فہم و بصیرت کو سراہتے ہوئے اپنا ہاتھ بھی دوبارہ بڑھا دیا' "تھینک یو سر' میں سوچتا ہوں' میں گھر چلا ہی جاؤں۔"

"مائی گاڈ' تم تو پورا صاحب ہے! تمہارا وائف بھی تمہارا مافق میم صاحب تو نہیں ہے نہ؟ نہیں تو پورا جوک ہو جائے گا۔"

ڈائریکٹر چلا گیا' لیکن اس کی آخری بات سین کے دماغ میں ہتھوڑوں کی طرح بجتی رہی' "تمہاری وائف بھی تمہاری طرح میم صاحب تو نہیں ہے نہ؟ آئی ہوپ یور وائف از ناٹ میم صاحب' ناٹ اے میم صاحب' ناٹ اے میم صاحب---"

"میم صاحب! ان کی بیوی؟" لنچ کھانے کے لئے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے وہ سوچنے لگے۔ ایسا کوئی امکان نہیں تھا۔ کہنے کو تو وہ انگریزی ادب میں ایم۔ اے تھی۔ لیکن وہ تو اپنے ملک میں ایسے کئی لوگوں سے مل چکے تھے' جو ڈگریوں کی لمبی لائنوں کے باوجود انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ زیادہ دور کیا جانا تھا؟ ڈائریکٹر صاحب کو ہی دیکھ لیں؟

رخصتی کے وقت کافی رونا دھونا ہوتا رہا تھا۔ دلہن تو کار میں بیٹھی دیر تک بسورتی رہی۔ آنکھوں تک گھونگھٹ نکلا ہوا تھا' اور باقی چہرہ ناک پونچھنے کے لئے لگائے ریشمی رومال سے ڈھکا تھا۔ سین نے پائپ جلایا تو اس نے رومال کو ناک پر اور بھینچ لیا'

"تمہیں دھوئیں سے تکلیف تو نہیں؟" یہی پہلا فقرہ تھا جو سین نے اپنی بیوی سے بولا تھا۔ اس نے انکار میں زور سے سر ہلا دیا تھا۔

لنچ کھانے کے لئے سڑک کے کنارے ایک آم کے باغیچے کے پاس انہوں نے موٹر گاڑی روکی۔ ان کی ماں نے دونوں کے لئے الگ الگ لنچ پیکٹ پر نام لکھ کر دیئے تھے۔ جن پر "سنی" لکھا تھا' اس میں تھا' بھنا ہوا مرغ اور چیز سینڈوچ۔ دوسرے میں ابلا ہوا بھات' آچار اور ایک کٹورے میں سبزی۔ ان کی بیوی نے بھات پر سبزی انڈیلی اور ہاتھ سے کھانے لگی۔

وہ دونوں ایک دوسرے سے بولے بغیر ہی چپ چاپ کھاتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ان کے چاروں طرف گاؤں کے بچے آکر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ آتے جاتے راہ گیر بھی رک رک کر تماش بینوں کی طرح کھڑے ہو کر انہیں دیکھنے لگی۔ کچھ وہیں کار کے پاس کولھوں پر بیٹھ گئے۔ نوبیاہتا جوڑا دیکھ کر سب تجسّس سے گھور رہے تھے۔ سین جانتا تھا' ان گنوار لوگوں سے کیسے نمٹنا چاہئے۔ اس نے طنزیہ آواز میں پوچھا:

"کیا تم لوگ بھوکے ہو؟"

آدمی تو چپ چاپ سنتے ہی کھسک گئے' لیکن کچھ شیطان چھوکرے وہیں ہی رکے رہے۔ سین اپنا ہاتھ اٹھا کر گرجا' "بگر آف' یو ڈرٹی باسٹرز!" چھوکروں نے تھوڑی دوری پر جاکر سین کی نقل اتارنی روع کر دی' "بگراف' بگراف! ایں' ایں' یہ تو صاحب ہئیں' بڑکا صاحب!"

سین نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بیوی سے مسکرا کر کہا' "ناشائستہ زبان کے لئے معاف کرنا۔ ایک سینڈوچ کھا کر دیکھو گی؟ معلوم نہیں' تم میٹ کھاتی ہو یا نہیں؟ یہ سلا اور پنیر والا لے لو۔ بالکل تازے چیڈر چیز کا بنا ہے۔"

مسز سین نے اپنے تری سے آلودہ ہاتھوں سے سینڈوچ پکڑ لیا۔ روٹی کی طرح سینڈوچ میں سے ایک ٹکڑا توڑ کر سبزی کے شوربے میں ڈبو کر منہ میں ڈالا۔ ایک لقمہ کاٹ کر ہی اس نے چبانا بند کر دیا۔ اپنے موٹے چشمے میں سے سین کی طرف ایسے دیکھا' جیسے انہوں نے اسے زہر ہی کھانے کو دے دیا ہو۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ لقمہ اندر نگلا نہ جا رہا تھا' اس لئے اس نے باہر تھوک دیا اور دوسری طرف منہ پھیر کر اپنا وہی سبزی بھات کھانے لگی۔

سین نے ہکلاتے ہوئے معافی مانگی' ''آئی ایم ڈریڈ فلی سوری' چیڈر چیز تمہیں اچھا نہیں لگا' مجھے پہلے ہی سوچنا چاہئے تھا۔''

مسز سین نے اپنا منہ ساڑھی کے کنارے سے پونچھا اور پانی مانگا۔ کلی کر کے پانی کے چھینٹے منہ پر مارے۔ لنچ کا سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا تھا۔ سین نے کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا' ''اگر تمہاری طبیعت ٹھیک ہو تو گاڑی سٹارٹ کروں؟''

مسز سین نے کٹورے کو کپڑے میں باندھا اور گاڑی کی طرف بڑھی۔ اندر بیٹھ کر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے چاندی کی ایک ڈبیہ نکالی اور پان بنانے لگی۔ ایک پتے میں چونا' کتھا' کٹی سپاری کے کچھ ٹکڑے اور الائچی ڈال بیڑا بنا کر خاوند کی طرف بڑھایا۔

''معاف کرنا' میں پان نہیں کھاتا۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو میں اپنا پائپ سلگا لوں؟''

مسز سین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بیڑا اس نے اپنے منہ میں ٹھونس لیا اور مزے سے چبانے لگی۔

وہ وقت پر ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس کے بیرے نے سامان سنبھالا اور بستر لگا دیا۔ اس نے مسز سین سے کھانے کے بارے پوچھا۔ مسز سین نے اسے صاحب سے پوچھنے کو کہا۔ صاحب نے جواب دیا' ''میرے لئے کچھ بھی بنا دو۔ آملیٹ وغیرہ چلے گا۔ میم صاحب سے پوچھ لو' وہ کیا پسند کریں گی۔ جب تک میں ذرا گھوم کر آتا ہوں۔''

''صاحب' ذرا دور مت جائیے گا۔ یہ جنگلی علاقہ ہے' احتیاط سے گھومئے گا۔ دریا پر جانے کے لئے ایک پگڈنڈی ہے۔ صاحب لوگ مچھلی پکڑنے کے لئے اس پگڈنڈی کے راستے سے جاتے ہیں۔ یہ راستہ صاف ہے۔'' بیرے نے سمجھایا۔

سین نے سونے کے کمرے میں جا کر بیوی سے پوچھنا چاہا کہ کیا وہ ان کے ساتھ ٹہلنے جانا چاہتی ہے۔ دیکھا' وہ اپنا سامان کھول رہی تھی' اس لئے انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا' ''میں ذرا دریا تک گھومنے جا رہا ہوں۔ بیرے کو بولنا' برآمدے میں سوڈا اور سکاچ رکھ دے۔ میرے سوٹ کیس میں ایک بوتل رکھی ہے۔ کھانے سے پہلے پی لیں گے۔''

بیوی نے سر ہلا کر حامی بھری۔

مچھیروں کے جانے والی پگڈنڈی سال کے گھنے درختوں کے درمیان سے ہو کر نکلتی تھی۔ پگڈنڈی دریا کے کنکروں پتھروں سے بھرے کنارے پر جاکر ختم ہوتی تھی۔ گنگا کا نظارہ بڑا ہی دلکش تھا۔ دریا کے چوڑے پاٹ پر برف جیسا ٹھنڈا نیلا پانی سورج کی سنہری کرنوں سے چمک رہا تھا۔ مسٹر سین سوچ رہے تھے کہ ایسی پرسکون سنسان جگہ پر کھڑے ہو کر گنگا کی تعریف کرتے ہوئے سادھو سنتوں نے اسے دنیا کے تمام دریاؤں سے متبرک قرار دیا ہو گا۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ اپنے آریہ جد امجد کے ساتھ یکسو ہو گئے ہیں۔ ان کے جد امجد فطرت کے پجاری تھے۔ وہ سورج کی حرارت کے گیت گاتے تھے۔ پورن چند کی آرادھنا میں سوم رس پیتے تھے۔ وہ گوشت بھی کھاتے تھے اور بھرپور جوان لڑکیوں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔ گنگا تب سے کتنا لمبا سفر کر چکا ہو گا۔ اب تو ہندومت خود ہی دریا سا بن گیا ہے۔ گنگا کے آخری کنارے' ہگلی دریا سا' جس کے کنارے آباد کلکتہ شہر میں ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ ہری دوار' بنارس' الہ آباد' پٹنہ اور ایسے ہی کئی تیرتھ مقامات میں ہزاروں ہی تیرتھ یاتری اور دوسرے شہریوں کے ذریعے جلائی گئی لاشیں وغیرہ پھینکنے کے باعث آلودہ ہوئی گنگا کلکتے تک پہنچتے پہنچتے تک تو کیچڑ اور گندگی کی ٹھہری ہوئی ایک وسعت بن کر رہ گئی ہے۔ ہندومت بھی اب صرف شراب گوشت نہ کھانے والوں اور پان چبانے والوں کی وراثت بن کر رہ گیا تھا۔ بننے دو' ان کا کیا جاتا ہے؟ وہ تو سامنے چمکتی اس شفاف جل دھارا' جیسے قدیم ہندومت کے پجاری تھے۔ اکثریت کا ہندومت تھا بڑے دریا جیسا --- صدیوں سے چلی آئی قدامت پسندی کی گندگی سے مذموم ہوا۔ وہ پتھریلے راستے پر بڑھتے ہوئے دریا تک پہنچے۔ ٹھنڈا سرد پانی چلو میں بھرا اور منہ پر جھڑک لیا۔

جنگل کے درختوں کا سایہ دریا پر لمبا ہو کر پڑنے لگا۔ پروانوں' پتنگوں کی آوازوں سے جنگل گونج رہا تھا۔ سین پیچھے مڑے اور جلدی جلدی اپنے ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھنے لگے۔ سورج ڈوبنے کو تھا۔ شام کی شراب کا وقت ہو چلا تھا۔

برآمدے میں گلاس لگے تھے اور سوڈے کی بوتلیں پاس پڑی تھیں۔ بیرا ہاتھ میں چابیوں کا گچھا لے کر آیا' "صاب آپ کا بکس ہم کیسے کھولے گا؟ آپ وہسکی نکال دیجئے' صاب!"

"ارے' تم بیگم صاحب کو کیوں نہیں بولا' نکالنے کو؟"

بیرے نے گردن جھکا لی' "میم صاب، بولا کہ وہ وہسکی کا بوتل چھونے نہیں سکتیں۔ ہم کو چابی دے دیا۔ پر صاب' آپ کا سامان کو ہم کیسے--- اگر کوئی چیز گم ہو---"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' تم ہمارا سوٹ کیس کھولو۔ وہسکی' برانڈی کی بوتلیں اوپری پڑی ہیں' لے آؤ اور میم صاحب تیار ہو جائیں' تو ڈنر سرو کر دو۔"

صاف ظاہر تھاکہ بیوی کو اپنے ساتھ بیٹھ کر ساتھ دینے کے لئے کہنا بیکار تھا۔ انہوں نے اپنے لئے سکاچ کا ایک بڑا پیگ بھرا اور اپنا پائپ سلگانے بیٹھ گئے۔ ایک بار وہ پھر اپنی زندگی کے اس انوکھے موڑ پر سوچنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اگر یونیورسٹی کے دنوں میں ملی انگریز لڑکیوں میں سے کسی ایک سے شادی ہوئی ہوتی تو بات کچھ اور ہی تھی۔ شادی کے دوران ہی انہوں نے کئی بار ایک دوسرے کو چوما ہوتا۔ شادی کی رات کی تو بات ہی کیا؟ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جنگل کے بیچوں بیچ بھٹکتے اور دریا کے کنارے پر پیار کرتے۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹتے اور سکاچ کی چسکیاں لیتے۔ پیار کرتے کرتے وقفے وقفے سے کچھ چباتے رہتے۔ اندھیرا ہونے تک پیار کرتے رہتے' تو بھی دل نہ بھرتا۔

وہسکی پینے کے بعد ان کے خون کا دباؤ بڑھنے لگا۔ تصور مضبوط ہو اٹھا۔ وہ انگلینڈ میں واپس پہنچنے لگے۔ سامنے پھیلتے اندھیرے اور گھنے جنگل کے سایوں نے ان کی اداسی کو مزید گہرا دیا۔ اپنے ہی ملک میں وہ اپنی ہی نظروں میں اجنبی سے بن گئے تھے۔

ان کی بیوی آئی اور اپنے بنگالی لہجے میں بولی' "یو وانٹ ٹوشٹ آؤٹ شائڈ؟"

ان کی نیند ٹوٹی اور انہوں نے روکھائی سے پوچھا' "واٹ؟"

"ڈو یو وانٹ شٹ آؤٹ شائڈ؟ ڈنر از اون دی ٹیبل۔"

ان کا دل افسردگی سے بھر گیا۔ گڈ لائڈ۔ اگر اس نے ان کے کسی انگریز دوست کے سامنے اس قدر بولا ہوتا' تو وہ کیا سوچتا؟ "اوہ' میں ابھی آتا ہوں' تم چلو۔ آئی ول جائن یو ان اے سیکنڈ۔"

یہی پہلا موقع تھا' جب مسز سین ان سے کچھ بولی تھی۔

ڈائننگ روم میں داخل ہوتے ہی ناریل کے تیل کی میٹھی مہک اور گلاب کے پھولوں کی بھینی خوشبو ان کے نتھنوں میں گھسی۔ ان کی بیوی نے سر دھو کر تیل لگایا

تھا۔ گھنگھریالے بال اس کی کمر کے نیچے لٹک رہے تھے۔ بیاہتا عورت کا سہاگ کا نشان سیندور اس کی مانگ میں بھرا تھا۔ جسم گلاب کے عطر سے مہک رہا تھا۔ ضرور اس کی ماں نے سمجھایا ہو گا۔ میز پر وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھی رہی۔ ہندو عورت تھی۔ خاوند جب تک نہ کھائے' وہ کیسے کھانا شروع کر سکتی تھی۔

"سوری' تمہیں انتظار کروایا۔ تمہیں کھانا شروع کر دینا چاہیئے تھا۔ تمہارا کھانا تو ٹھنڈا ہو گیا ہو گا۔"

اس نے صرف سر ہلا دیا۔ ان دونوں نے کھانا شروع کیا۔ انہوں نے اپنے آملیٹ اور مکھن لگی ڈبل روٹی کو کانٹے چھری سے اور اس نے بھات' دال' ترکاری کو انگلیوں سے۔ بات چیت شروع کرنے کے لئے سین نے کئی بار کھانس کر اپنا گلا صاف کیا۔ لیکن ہر بار بیوی کے موٹے چشمے کے پیچھے پھیلی خالی نگاہ کو دیکھ کر انہیں محسوس ہوا کہ سب بیکار ہو گا۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پائے گی۔

ان کے دوستوں کو معلوم ہو' تو وہ ان پر ہنسے گے ہی' "اوہ' سنی سین' ارے وہ اپنی بیوی سے بات کیسے شروع کرے گا۔ کسی نے بیوی کا اس سے باقاعدہ تعارف کرایا ہی نہیں۔ بھئی' جانتے نہیں وہ انگریز ہے۔"

ڈنر خاموشی میں ہی ختم ہو گیا۔ کلیانی سین نے ہلکے سے ڈکار لی اور اپنا پاندان نکال کر بیٹھ گئی۔ ایک بیڑا بنایا' لمحہ بھر کو کچھ سوچا اور بیڑا منہ میں بھر لیا۔ سنی نے پہلے سے ہی سوچا ہوا تھا کہ ہنی مون پر اپنے قیمتی ہوانا سگار پئیں گے۔ اپنے لمبے سگار دان میں سے ایک سگار نکال کر انہوں نے اس کی نچلی طرف سے سونے کی کلپ سے چھید کیا اور سلگا لیا۔ سگار کے خوشبودھار دھوئیں سے کھانے کا کمرہ بھر گیا۔ اب کی بار کلیانی نے منہ پر ساڑھی کا پلو نہیں رکھا۔ بس صرف انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر منہ کے قریب اس طرح رکھیں کہ نتھنوں میں دھویں کی بو بھی نہ جائے' اور سین صاحب کو برا بھی نہ لگے۔

وہ دونوں میز پر چپ چاپ ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے رہے۔ سین کو لگا کہ وہ پان چباتی ہوئی بالکل جگالی کرتی گائے کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ پھر اپنا سگار پینے میں مصروف ہو گئے۔ بڑی مشکل صورت حال تھی' دونوں کے درمیان کا پردہ --- ناقابل عبور۔ سین نے گھڑی کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے' "نیوز۔" وہ ذرا

اونچی آواز میں بولے' "نیوز مس نہیں کرنا چاہئے۔" وہ سونے کے کمرے میں جاکر اپنا ٹرانسسٹر لے آئے۔

کمرے میں دو پلنگ لگے ہوئے تھے' ایک ساتھ ملے ہوئے۔ تکئے تقریباً" ایک دوسرے سے ہم آغوشی کرتے ہوئے۔ چادروں پر خس کی خوشبو چھڑکی ہوئی تھی' جیسے انہیں بھی صبح مکمل ہوئی شادی کی تکمیل کو دیکھنے کا انتظار تھا۔ سین سوچ رہے تھے کہ اسے وہ سب تیاری کرنے کا خیال ہی کیونکر آیا' جبکہ ابھی تک ان کا آپس میں تعارف بھی ٹھیک سے نہیں ہوا ہے! بس' دو چار غیر رسمی باتیں ہی تو ہوئی تھیں۔ اپنا ریڈیو اٹھا کر وہ تیزی سے کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔

دہلی سٹیشن لگایا۔ بیرا میز صاف کرتا رہا۔ وہ خبریں سنتے رہے۔

"گڈ نائٹ سر!" بیرا سلام کرکے چلا گیا۔ مسز سین بھی اٹھیں۔ اپنا پاندان اٹھایا اور سونے کے کمرے میں چلی گئیں۔ پندرہ منٹ کی خبروں کے بعد کھیلوں پر کمنٹری شروع ہوئی۔ سین نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی' لیکن انہیں خوشی تھی کہ انہوں نے کمنٹری سننے کا حوصلہ بنائے رکھا تھا' کیونکہ اس کے بعد ہی پروگرام میں کچھ تبدیلی ہونے کا اعلان ہوا تھا۔ یعنی کہ استاد بڑے غلام علی خان کے کلاسیکی گانے کی جگہ پر دہلی "چیک آرکسٹرا" ریلے ہونے والا تھا۔ بھارتی موسیقی میں غلام علی خاں سب سے بڑا نام تھا۔ یہاں تک کہ انگریزی شدہ ہندوستانی بھی ان کے گانے کی تعریف کرنے کا دم بھرتے تھے۔ غیر ملکی لیڈر بھی اس عظیم گلوکار کی محفلوں میں چار چار گھنٹے حوصلے کے ساتھ بیٹھے رہتے کہ کہیں ان کے ہندوستانی میزبان برا نہ مان جائیں یا دوسرے سفارت خانے کے اہلکار انہیں بے ذوق نہ سمجھ بیٹھیں۔ "چیک آکسٹرا" ہندوستان میں پہلی بار آیا تھا' اور دہلی کی "یورپئن موسیقی سوسائٹی" والوں کو ان کے ساتھ مکمل کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ کتنے افسوس کی بات تھی کہ ایسے موقع پر وہ دہلی میں نہیں تھے' نہیں تو اس موقع پر خاص خاص لوگوں کو رات کے کھانے پر بلاتے اور کھانے کے بعد موسیقی کی محفل کا پروگرام رکھتے۔ وہ سوچنے لگے کہ ایسی پارٹی میں ان کی بیوی بھلا کس طرح نظر پر چڑھتی۔

ریڈیو پر تالیوں کی گڑگڑاہٹ سنی۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ پروگرام کا آغاز "سمیتانا" کے "دی بارٹرڈ" سے ہو گا۔ سین "کانونٹ گارڈن" اور "فیسٹیول ہال" میں

گزاری شاندار شاموں کی یادو میں بھٹکنے لگے۔ "میتانا" کے بعد باری آئی "بارتوک" کی۔ وقفے وقفے سے بجنے والی تالیاں ہی جادو کے اثر کو توڑ جاتیں۔ ان بچارے اناڑی ہندوستانیوں کو کون سمجھائے کہ تالیاں سنفنی کے آخر میں بجائی جاتی ہیں' وقفے وقفے سے نہیں۔

درمیان میں چھ منٹ کا وقفہ ہوا۔ اختتام ہوا سین کے دل پسند "ڈوارکس سنفنی" نمبرپانچ سے۔ انہوں نے اپنے لئے وی۔ ایس۔ او۔ پی برانڈی گلاس میں انڈیلی' ایک کرسی سامنے کھینچی اور پاؤں پسار کر کرسی میں لیٹ سے گئے "ڈوارک" کو اتنی اچھی طرح تو انہوں نے انگلینڈ میں بھی نہیں سنا تھا۔ منہ میں کیوبن سگار' اتنی بڑھیا "کوگنیک" شراب اور دنیا کی سب سے بہترین موسیقی۔ آدمی کو اور کیا چاہئے؟ انہوں نے اپنے سگاوی راکھ جھاڑی اور آرام کرسی میں لیٹے لیٹے لطف کی حالت میں آنکھیں مونڈھے پڑے رہے۔ جلتا ہوا سگار ہونٹوں میں دبائے ہی وہ گہری نیند سو گئے۔

نہ تو موسیقی کی محفل کے اختتام پر تالی بجانے کی آواز اور نہ ہی ریڈیو کی گڑگڑاہٹ انہیں نیند سے جگا سکی۔ سگار جب انہیں زیادہ گرم لگا' تو ان کے ہونٹ کھلے اور وہ ان کی گود میں گر پڑا۔ آہستہ آہستہ جلتے ہوئے سگار سے ان کی پتلون جلنے لگی۔ وہ گھبرا کر جاگے اور انہوں نے سگار کے ٹکڑے کو اٹھا کر جلدی جلدی زمین پر پھینکا۔ ویسے تو پتلون زیادہ نہیں جلی تھی۔ فلائی بٹن کے پاس محض ایک سوراخ ہی ہوا تھا' لیکن سارے کمرے میں جلے ہوئی کپڑے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سین نے سوچا کہ بال بال بچے۔ ریڈیو بند کرکے انہوں نے گھڑی دیکھی۔ آدھی رات سے زیادہ کا وقت ہوگیا تھا۔ بتی بجھا کر وہ اپنے سونے کے کمرے میں چلے گئے۔

پلنگ کے پاس میز پر لیمپ اب بھی جل رہا تھا۔ لگتا تھا ان کی بیوی ان کا انتظار کر کرکے سو گئی تھی۔ اس نے کپڑے بھی تبدیل نہیں کئے تھے' نہ ہی زیور اتارے تھے۔ آنکھوں میں کاجل لگا ہوا تھا۔ آنسوؤں سے بہہ کر کاجل گالوں تک کھنچ گیا تھا۔ تکیہ بھی کاجل سے لتھڑا ہوا تھا۔

پاجامہ تبدیل کرکے سین اپنے بستر میں گھس گئے۔ بیوی کے اٹھتے گرتے سینے کی طرف دیکھا' اس کے منہ کی طرف بھی۔ نہیں' نہیں' ان کی ذرا بھی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ انہوں نے لیمپ کی بتی بجھا دی۔ بتی کی زرد لو نیلی ہوئی' دو ایک بار پھڑ

پھڑاہٹ اور سارے کمرے کو اندھیرے میں ڈبوتی ہوئی غائب ہو گئی۔
صبح بیرا چائے کی ٹرے کے ساتھ آیا اور انہیں جگانے لگا' "صاحب' نو بج چکے ہیں۔ میم صاحب کو اٹھے تو چار پانچ گھنٹے ہو گئے۔ وہ نہا چکی ہیں۔ آپ کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔"
سین نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سورج کی دھوپ برآمدے میں سے ہوتی ہوئی کمرے میں پھیل رہی تھی۔ بیوی نے اپنا بستر گول کرکے اپنے سٹیل کے ٹرنک کے اوپر جما دیا تھا۔ اٹھتے ہوئے وہ بولے' "میری چائے برآمدے میں لے آنا۔" غسل خانے میں جاکر انہوں نے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور باہر نکل آئے۔
"سوری ٹو کیپ یو ویٹنگ (میں ہمیشہ تمہیں انتظار کراتا رہتا ہوں' معاف کرنا۔) لیکن تمہیں میری راہ نہیں دیکھنی چاہئے۔" جمائی لیتے ہوئے وہ کرسی پر پسر گئے۔
ابھی وہ چھت کی طرف ہی دیکھ رہے تھے کہ ان کی بیوی اٹھی اور آگے بڑھ کر ان کے پاؤں چھونے لگی۔ وہ اس کے خاوند تھے' مالک۔ گھبرا کر انہوں نے اس کی طرف دیکھا۔ گالوں پر آنسوؤں کی دھار بہہ رہی تھی۔ پلکیں اٹھا کر کچھ سوالیہ اور کچھ خوفزدہ آواز میں وہ بولی' "میں آپ کے قابل نہیں!" اور ان کے جواب دینے سے پہلے ہی ساڑھی کا پلو آنکھوں پر رکھ کر وہ تیزی سے اندر چلی گئی۔
"یہ بھی کیا بلا ہے۔" بڑ بڑاتے ہوئے سین کرسی میں دھنس گئے۔ سمجھ تو گئے تھے کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ دھوپ میں چمکتے لان کے خلاء میں نظر مرکوز کرکے دیر تک سوچتے رہے۔ تب بھی دل میں خواہش نہ ہوئی کہ اندر جاکر بیوی کو منالیں۔
بیرا آیا۔ چائے کی ٹرے ویسے کی ویسے دیکھ کر اسے اچھا نہیں لگا۔ خیر' بتا گیا تھا کہ ناشتہ میز پر لگ چکا ہے۔ سین بے دلی سے اٹھے۔ جانتے تھے کہ وہ کھانے نہیں آئے گی' جب تک کہ وہ اسے منا کر نہیں لاتے۔ اور ایسا کرنے کا ان کا قطعی ارادہ نہیں تھا۔ لیکن وہ غلط ثابت ہوئے۔ وہ تو پہلے ہی سے میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھنے سے کترانے لگے۔
"چائے؟" انہوں نے اس کا کپ بھر دیا' پھر اپنا بھی۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنی اپنی طرح کا ناشتہ اپنے اپنے طریقے سے بغیر ایک دوسرے سے ایک لفظ بھی بولے' خاموشی سے ختم کیا۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی اس نے اپنا پان لیا اور انہوں نے اپنا پائپ۔ وہ

اپنے سونے کے کمرے میں چلی گئی اور وہ اپنا ٹرانسسٹر لے کر صبح کی خبریں سننے برآمدے میں۔

دوپہر کو ڈاکیئے کو دیکھا تو انہیں ایک ترکیب سوجھی۔ لفافہ دفتر کی طرف سے آیا تھا۔ ان کی پندرہ دنوں کی چھٹی منظور ہو گئی تھی' لیکن سین لفافے کو ہلاتے ہوئے بیوی کے پاس گئے۔ لفافے کے اوپر لکھا تھا۔۔۔ ''بھارت سرکار کی سیوا میں۔'' بیوی سے بولے' ''ہم لوگوں کو ابھی واپس لوٹنا پڑے گا۔ منسٹر کی طرف سے ضروری خط آیا ہے۔ پارلیمنٹ میں انہیں ہمارے محکمے سے متعلقہ کچھ باتوں کی جواب دہی کرنی ہے۔ میں بیرے کو بھیجتا ہوں کہ سامان باندھنے میں تمہاری مدد کر دے۔ تب میں کار کو ذرا چیک کر لوں۔'' وہ باہر نکل گئے' ''بیرا بیرا!''

آدھے گھنٹے کے اندر ہی ان کی کار دہلی جانے والی سڑک پر تھی۔

شام ہونے سے پہلے ہی سین اپنے گھر کے پورٹیکو میں جاکر رکے۔ ماں اور بیٹے نے ایک دوسرے کو گلے لگایا' اور تب الگ ہوئے' جب دلہن ساس کے پاؤں چھونے آگے بڑھی۔ بہو کے کندھوں کو چھوتے ہوئے بڑھیا نے آشیرواد دیا' ''بھگوان' سکھی رکھے بیٹی۔۔۔ لیکن اتنی جلدی!''

بیٹے نے جیب سے لفافہ نکال کر دکھایا' ''منتری جی نے بلایا ہے۔ ان لوگوں کو کسی کی ذاتی زندگی کی کیا پرواہ ہے؟ بس' آنا پڑا اس لئے۔''

''اچھا' اچھا۔'' آنسو پونچھتے ہوئے ماں بولی' ''بہو' تمہارے ماں باپ خوش ہوں گے' یہ جان کر کہ تم لوگ لوٹ آئے۔ ایک بار ان کو فون کر لو۔''

تھوڑی ہی دیر میں مسز سین کے ماں باپ ٹیکسی سے پہنچ گئے۔ ملنے پر دوبارہ رونا دھونا شروع ہوا' منتری جی کے بلاوے کی ایک اور توضیح۔ لیکن انہیں تسلی تھی۔ لڑکی خاوند کے ساتھ ایک رات گزار چکی تھی۔ شادی مکمل ہوئی تھی' اب تو کچھ دنوں کے لئے وہ اپنے ماں باپ کے گھر جا سکتی تھی' وہ کلیانی کو اپنے گھر لے گئے۔

اگلا دن سین نے کتابوں کی دکانوں اور کافی ہاؤسوں میں گھوم گھوم کر کاٹا۔ ایسے ہی ہفتہ ختم ہوا۔ اتوار کو ماں جب پوجا میں مصروف تھیں' سین نے ڈائریکٹر صاحب کا نمبر ملایا اور کام پر واپس پہنچنے کی اطلاع دی' ''ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی' اس لئے جلدی لوٹنا پڑا۔ اتنے دن ان کو اکیلے چھوڑنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔'' وہ جانتے

تھے کہ یہی کہہ کر ڈائریکٹر کی ہمدردی اور منظوری حاصل کی جا سکتی تھی۔ ڈائریکٹر نے ان کے بارے ہمدردی ظاہر کی اور بیوہ ماں کے بارے ایک اچھے ہندو بیٹے کا فرض نبھانے کے لئے ان کی تعریف بھی کی۔ وہ بولے' ''اچھا بھئی' جیسے ہی تمہاری ماتا جی ٹھیک ہو جائیں' تمہاری شادی کی دعوت ضرور لیں گے اور تمہاری بھابھی سے ملاقات۔۔۔!''

''یس سر' جیسے ہی وہ ٹھیک ہو جاتی ہے' ہم آپ کو دعوت دیں گے۔''

ماں کی بیماری کا بہانہ بنا کر سین اپنی چھٹی رد کرنے کی کیفیت دیتا رہا اور اسی طرح پارٹی کو بھی ٹالتا رہا۔ سنتا سنگھ نے سین کے سہارے کافی موج مستی اور اودھم مچانے کی سوچی ہوئی تھی۔ بے چارہ وہ بھی مایوس ہو گیا۔

دن گزرے اور پھر ہفتے۔ کلیانی وقفے وقفے سے اپنا کچھ نہ کچھ سامان لینے اپنی ماں کے ساتھ آتی رہی۔ وہ تب ہی آتی' جب سین گھر پر نہیں ہوتے۔ صرف ساس سے ہی مل کر چلی جاتی۔ سنی سین کو ظاہر کر دیا گیا تھا کہ ایسی حالت میں خاوند کو ہی بیوی کے ماں باپ کے گھر جاکر اسے واپس لانا ہوتا ہے۔ لیکن سین کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹالتا رہا۔ اور ایک دن اچانک ہی جنوبی بھارت کا دورہ بنا کر نکل گیا۔ واپس لوٹنے کے پندرہ دنوں تک بھی لڑکی کے ماں باپ کو اس کے لوٹنے کی خبر نہ ہوئی۔ دونوں گھرانوں کے درمیان تعلقات روز بروز کشیدہ ہوتے گئے۔ کسی نے کچھ صاف صاف تو نہیں کہا' لیکن لوگوں میں بات پھیلنے لگی کہ سین گھرانے کو تو بھاری جہیز کی امید تھی۔ سین کی ماں شاید لڑکی کو تنگ کرتی تھی۔ ایک دن سین کو اپنے سسر کا ایک خط ملا۔ زبان نرم تھی' لیکن مایوسانہ۔ لگتا تھا' کسی وکیل سے مشورہ کرکے ہی خط لکھا گیا تھا۔ ضرورت کے لئے ایک نقل بھی منسلک تھی۔ ساری تفصیل دی گئی تھی کہ کس طرح شادی کے اشتہار کے ذریعے شادی طے ہوئی تھی' سگائی اور شادی پر کتنا خرچ آیا اور فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں سہاگ رات منائی گئی۔ سین سے پوچھا گیا تھا وہ اپنی مرضی صاف صاف ظاہر کرے۔

پہلی بار سین کو لگا کہ معاملہ سنجیدہ ہو چلا تھا۔ وہ ماں کی طرف مڑا۔ ماں بیٹے کے تعلق نے ایک نیا موڑ لیا تھا۔ ماں نے کہا' ''یہ ہمارے لئے بڑی شرمناک بات ہے۔ بات کو زیادہ نہیں بڑھانا چاہئے۔ اب تم جاکر اسے لے ہی آؤ۔ میرا کیا' میں کچھ دنوں

کے لئے ڈیرہ دون چلی جاؤں گی' بھائی کے پاس۔"

"نہیں' نہیں' ماں' میں کسی کو تمہارے اوپر انگلی نہیں اٹھانے دوں گا' اور تم مجھ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتیں۔"

"ارے بیٹا' کسی نے مجھ پر کوئی الزام نہیں لگایا' اور نہ ہی میں تمہیں چھوڑ کر کہیں جا رہی ہوں۔ میرا گھر تو یہی ہے۔ اپنے خون کو چھوڑ کر بھلا میں اور کہاں جا سکتی ہوں۔ لیکن تم اپنی بیوی کو ضرور لے آؤ۔ اب اس کو مالکن کے حق میں اپنا گھر سنبھالنے دو' میں بعد میں آجاؤں گی۔ خرید و فروخت' نوکر چاکروں کے جنجھٹ سے فارغ ہو کر تب آرام سے رہوں گی۔"

سین تھک کر پھر اپنی کرسی میں سمٹ گئے۔ پیچھے سے آکر ماں نے ان کا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا' "تم کوئی فکر نہ کرو بیٹا' میں بھائی کو لکھ کر کہتی ہوں کہ مجھے لے جاؤ۔ وہی تمہارے سسر جی کے پاس بھی ہو آئے گا اور تمہاری بہو کو لے آئے گا۔ جانے سے پہلے میں اسے سب دکھا سمجھا دوں گی' اور چابیاں بھی سونپ دوں گی۔ نوکروں چاکروں کو بھی بتا دوں گی کہ اب وہی ان کی مالکن ہے۔ جب تم دفتر سے لوٹو گے تو دیکھو گے کہ سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔" اس نے بیٹے کا سر چوما' "ارے بیٹا' اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آنا۔ بچی ہی تو ہے ابھی۔ تم کو معلوم نہیں میری کتنی خواہش ہے کہ تمہارے بچوں کو گود میں لے کر کھلاؤں۔"

سین کو یہ سب تماشہ بالکل نہیں بھایا۔ انہیں اپنے آپ پر غصہ آیا کہ ایسی نوبت آنے ہی کیوں دی؟ اپنی بیوی پر تو اور بھی زیادہ کہ اسی کی وجہ سے ماں کو یہ شرمندگی اٹھانی پڑ رہی ہے' اور اپنا گھر چھوڑ کر جانا پڑ رہا ہے۔ اگر وہ ماں کو نہیں رکھے گی تو وہ بھی اس سے کوئی سروکار نہیں رکھیں گے۔ انہوں نے خانساماں کو سمجھا دیا کہ بیڈ روم میں سامان کس طرح لگانا ہے۔ اگر نئی مالکن کچھ پوچھیں تو کہہ دینا کہ صاحب ایسا ہی کرنے کو کہہ کر گئے ہیں۔

سوموار کو صبح جب بیرا چائے لے کر آیا' انہوں نے اسے کہا کہ لنچ کے لئے ان کی راہ نہ دیکھی جائے اور وہ میم صاحب سے کہہ دے کہ رات کے کھانے کے لئے بھی ان کا انتظار نہ کریں' کیونکہ وہ دفتر میں دیر تک بیٹھے کام کرتے رہیں گے۔ ناشتہ انہوں نے ماں اور ماما کے ساتھ بیٹھ کر کیا تھا۔ ماں سے وعدہ بھی کیا کہ وہ اسے یہاں

کے بارے لکھتے رہیں گے۔ ماں نے جانے سے پہلے انہیں جھڑک کر سمجھایا' "تم کو اپنے آپ کو اس کی جگہ رکھ کر سمجھانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کی پرورش دوسرے طریقے سے ہوئی ہے' لیکن پیار اور حوصلے سے سب کو جیتا جا سکتا ہے۔"

سب کے جانے کے بعد بھی سین دفتر میں بیٹھے رہے۔ پھر سیدھے جم خانہ کلب کی طرف چل پڑے۔ گھنٹہ بھر سوئمنگ پول کے پاس بیٹھے بیئر پیتے رہے اور تیرنے والوں کو تاکتے رہے۔ تیرنے والوں میں یورپئن سفارت کاروں کی بیویاں اور بچے تھے' پونی ٹیل میں بندھے بالوں اور بکنیوں میں خوبصورت پنجابی لڑکیاں تھیں' ڈائیونگ بورڈ سے چھلانگیں لگاتے' ٹارزن جیسے جسم والے کالج کے سانولے سلونے جوان چھوکرے تھے۔ کاش ان میں سے کسی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی ہوتی' جو امریکن انداز میں چیں چیں کرکے بول رہی ہو' اسے وہ خالص انگریزی بولنا سکھاتے۔

تیراک بھی گھر چلے گئے۔ سین نے لمبی آہ بھری اور اٹھ کر "بار" میں چلے آئے۔ وہاں کتنے ہی پرانے دوستوں نے انہیں گھیر لیا--- "ہائے سنی' یو اولڈ باسٹرڈ! یہ کیا سن رہے ہیں' تمہارے بارے میں۔"

سنی مسکرایا' "اب کیا گلا پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو بتانا ضروری ہے کہ---" ان میں سے تین دوست آگے بڑھے' "ہمیں ڈرنک کرانا تمہیں بنتا ہے' نہیں تو ابھی ننگا کرکے تمہیں عورتوں کے سامنے---"

"ہے' وہیں ٹھہرو' بیرا' ان بلڈی فولز کو دے دو جو مانگتے ہیں۔" دوست تب اونچے سٹولوں پر بیٹھ کر چیئرس کرتے ہوئے "باٹمز اپ" کرنے لگے۔

"ارے بیوی کہاں ہے تمہاری؟" ایک نے پوچھا' "یہ تو نہیں کر رہے ہو کہ تم بھی اسے اور ہندوستانیوں کی طرح پردے میں رکھتے ہو؟"

"ارے نہیں' ایسی بات نہیں۔ وہ اپنی ماں کے گھر گئی ہوئی ہے' اور ایک آدھ پیگ لو یار!"

وہ لوگ ایک کے بعد دوسرا پیگ چڑھاتے گئے' جب تک کہ "بار" بند نہیں ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے سین کو اپنے گھر کھانے کی دعوت بھی دی۔ سین نے چپ چاپ منظور کر لی۔

رات کو تقریباً" ایک بجے گھر لوٹے۔ پیئے ہوئے ہونے کی آڑ میں کسی بھی طرح

کے صورت حالات کا سامنا کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ہال کمرے کی بتی جلائی۔ دیوار کے سہارے بکسوں کی قطار لگی تھی۔ تو کیا ان کی بیوی واپس پہنچ چکی ہے! اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ تو کئی گھنٹے پہلے ہی سو گئی ہو گی۔ ہال کمرے کی بتی بند کرکے وہ دبے پاؤں آہستہ آہستہ اپنے سونے کے کمرے میں گئے۔ ٹیبل لیمپ جلایا' دروازہ اندر سے بند کیا اور گہری نیند سو گئے۔

بیرے کے دروازے کھٹکھٹانے پر ان کی نیند کھلی۔ دروازہ کھولنے جاتے ہوئے ان کا سر گھومنے لگا۔ بیرا کیا سوچے گا کہ صاحب اکیلے ہی اندر سے دروازہ بند کئے پڑے تھے' اور میم صاحب الگ سو رہی تھیں۔ اب جو سوچتا ہے' سوچنے دو۔ وہ کیا کریں؟ ابھی تو ان کا سر ویسے ہی گھوم رہا ہے۔

"صاب' میم صاب کے لئے چائے لے آؤں؟" بیرے نے پوچھا۔

"وہ بیڈ ٹی نہیں پیتیں۔ پھر وہ ابھی تک اٹھیں نہیں کیا؟"

"نہیں جانتا صاب' وہ بھی دروازہ اندر سے بند کئے ہیں۔"

سین کو ذرا سی بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ چائے کے کپ کے ساتھ ایک دو اسپرین کی گولیاں نگل کر وہ اپنے بستر پر پھر لیٹ گئے۔ اسپرین کو تھوڑا اثر کرنے دو۔ ان کا تصور دور تک دوڑنے لگا۔ نہیں' نہیں' وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ کبھی نہیں۔ شاید رات دیر گئے تک ان کا انتظار کرتی رہی ہو گی۔ اکیلے ہونے کے باعث خوف سے دروازہ اندر سے بند کر لیا ہو گا۔ دیر سے سونے کے باعث ہی ابھی تک نہیں اٹھی ہو گی۔ لیکن وہ اس کے ساتھ کتنی بے دلی سے پیش آتے رہے تھے۔ ہو سکتا ہے اس نے۔۔۔! معلوم تو کرنا چاہئے۔ وہ اٹھے اور اس کا دروازہ کھٹکھٹانے لگے۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ غسل خانے کی طرف گئے۔ ادھر بھی وہ نہیں تھی۔ ایک بار پھر اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کوئی آہٹ نہیں ہوئی۔ وہ کھڑکی کے پاس گئے اور انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس پر دھکا مارا۔ دونوں پٹ کھل کر دیوار سے جا ٹکرائے۔ اس کا شور سن کر بھی وہ نہیں اٹھی۔ انہوں نے اندر جھانک کر دیکھا۔۔۔ اس کا چشمہ ناک پر ٹکا تھا۔

زور سے چیخ مار کر سین گھر کے اندر بھاگے اور بیرے کو بلانے لگے۔ نوکر اور مالک نے مل کر کندھوں سے دروازے پر زور لگایا اور کنڈی ٹوٹ گئی۔ دروازہ کھلتے ہی دونوں کمرے کے اندر دوڑے۔ بستر پر لیٹی عورت پرسکون بے حس و حرکت پڑی تھی۔

اس کے منہ سے سفید رنگ کا جھاگ بہہ رہا تھا۔ موٹے چشمے میں سے اس کی آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ سین نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ یہ پہلی دفعہ اپنی بیوی کو چھو رہے تھے' جبکہ وہ مر چکی تھی۔

اس کے پلنگ کے ساتھ لگی تپائی پر ایک خالی گلاس اور دو لفافے پڑے تھے۔ ایک پر بنگالی زبان میں ماں کا نام لکھا تھا اور دوسرے پر ان کا۔ ایک مضحکہ خیز مسکراہٹ ان کے چہرے پر تیر گئی' جب انہوں نے پڑھا---

خدمت میں

"مسٹر ایس۔ سین صاحب۔"

# ریپ

ستاروں بھرے نیلے آسمان کو ایک ٹک سراہتے ہوئے دلیپ سنگھ چارپائی پر نڈھال پڑا تھا۔ گھٹنوں تک چڑھی لنگی کو چھوڑ کر باقی جسم ننگا تھا۔ پھر بھی سارے جسم سے سفید نشان جیسے انڈے پڑ رہے تھے۔ دن بھر دھوپ میں سینکی دیواریں گرم بھبکے چھوڑ رہی تھیں۔ اس نے ابھی ابھی گھر کی چھت پر پانی کا چھڑکاؤ کیا تھا' لیکن اس سے صرف اتنا ہی ہوا تھا کہ مٹی اور گوبر کی بھاپ میں بسی سوندھی بو اس کے نتھنوں میں بھرنے لگی تھی۔ پانی پی پی کر اس کا پیٹ بھر گیا تھا' پھر بھی گلاس خشک کا خشک ہی رہا۔ پھر اس پر مچھروں مسلسل بھنبھناہٹ۔ کچھ اس کے کانوں کے آس پاس منڈلانے لگے۔ کچھ جو اس کی گرفت میں آگئے' انگلیوں اور ہتھیلیوں کے درمیان مسلے گئے۔ کچھ تو کان کے راستے سے اندر ہی داخل ہو گئے۔ ایسے میں تیر نجنی انگلی سے کانوں کو کریدتے ہوئے وہ چکنی چپڑی دیواروں سے سر ٹکرا دیتا۔ کچھ ایک جو داڑھی کے بالوں میں گھس بیٹھے تھے'.انہیں تو اس نے وہیں دبا کر خاموش کر دیا۔ پھر بھی کچھ نے موقع پاتے ہی اس کی شریانوں میں ڈنک گاڑ دیئے۔ بے چارہ کھجلانے اور گالیاں دینے کے علاوہ اور کرتا بھی کیا؟

اس کے اور اس کے چاچا کے گھر کے درمیان ایک تنگ سی گلی تھی۔ چاچا کی چھت پر بچھی چارپائیوں کی قطاروں کو اپنی چھت سے وہ آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ ایک کنارے پر اس کا چاچا بنتا سنگھ ہاتھ پاؤں پسارے ایسے سویا پڑا تھا' جیسے کروس پر ٹنگا پڑا ہو۔ خراٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی توند اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ چارپائیوں کے دوسرے

سرے پر عورتوں کا جھنڈ پنکھے جھلتا ہوا آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے میں مشغول تھا۔

دلیپ سنگھ کی آنکھیں نہیں لگی تھیں۔ ویسے ہی پڑا پڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا' نہ تو اس کے دل میں چین تھا' نہ آنکھوں میں نیند۔ ادھر دوسری چھت پر اس کا چاچا--- اس کے باپ کا بھائی اور قاتل---- بے دھڑک سو رہا تھا۔ اس کے گھر کی عورتوں کے پاس وقت تھا' چھت پر بیٹھ کر ستانے اور باتیں کرنے کا' جبکہ خود اس کی ماں رات کے اس بیتے پہر' برتنوں کو راکھ سے رگڑ رہی تھی' اور آئندہ دنوں کا ایندھن جمع کرنے کے لئے گوبر اکٹھا کر رہی تھی۔ بنتا سنگھ کو کیا تھا؟ بھنگ گھونٹتا اور پڑا سوتا رہتا۔ نوکر چاکر جو تھے' مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے اور کھیت جوتنے کے لئے۔

اس کی ایک بیٹی تھی--- بندو' سیاہ کجراری آنکھوں والی۔ کام وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ جاپانی سلک کے کپڑے پہنے ادھر ادھر اتراتے پھرنے کے علاوہ۔ لیکن دلیپ سنگھ کے لئے تھا' کام اور صرف کام۔

کیکر کے درختوں میں ہلچل ہوئی۔ نرم ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا چھت کے اوپر سے گزرا اور مچھروں کو اپنے ساتھ اڑا لے گیا۔ لوگوں کو پسینے کی چپچپاہٹ سے راحت ملی۔ دلیپ کے گرمی سے جھلسے جسم کو بھی کچھ راحت محسوس ہوئی۔ پلکیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ بنتا سنگھ کی چھت پر عورتوں نے بھی پنکھے جھلنا بند کر دیا۔ اپنی چارپائی سے لگ کر کھڑی بندو نے سر کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا اور گہرا سانس کھینچا' جیسے تمام تازی ٹھنڈی ہوا کو سینے میں سما لینا چاہتی ہو۔ دلیپ نے دیکھا کہ اس نے چھت پر ٹہلنا شروع کر دیا ہے۔ اپنی چھت سے بندو نے گاؤں کے سارے آنگنوں اور چھتوں پر سوئے نیند میں مست لوگوں کا معائنہ کیا۔ سب گہری نیند میں سوئے پڑے تھے' کہیں کوئی ہلچل نہیں تھی۔ وہ اپنی چارپائی کے پاس جاکر رک گئی۔ گھٹنوں تک لٹکتے کرتے کے دونوں سروں کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چہرہ تک اٹھا لیا۔ کمر سے لے کر گلے تک اس کا سارا جسم ننگا ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا اس کے سپاٹ پیٹ اور جوان سینے کو اپنے غلاف میں بھرنے لگی تھی۔ تبھی کسی نے غصے میں کچھ بڑ بڑایا۔ ایک جھٹکے سے بندو نے کرتا نیچے کر لیا۔ وہ اپنی چارپائی پر جا پڑی اور تکئے کی گڈ مڈ سلوٹوں میں منہ چھپا کر لیٹ گئی۔

دلیپ سنگھ کو نیند کہاں؟ اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ بنتا سنگھ کا گھناؤنا جسم اب دل سے اتر گیا تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں' اور بندو کا تصور کرنے لگا' جس کو ستاروں کی روشنی میں ابھی ابھی دیکھا تھا۔ اسے اس کی چاہت ہوئی' سپنوں میں اسے پا لینے کا احساس بھی ہوا۔ بندو تو ہمیشہ ہی اس کے قریب آنا چاہتی تھی۔ چاہتی نہیں' درخواست بھی کر چکی تھی۔ دلیپ ہی کبھی راضی نہ ہوا تھا۔ بنتا سنگھ اس کا دشمن تھا اور ہمیشہ اسے نیچا دکھانے کی کوشش کرتا تھا۔

دلیپ سنگھ کی آنکھیں بند تھیں' لیکن وہ کسی دوسری ہی دنیا میں کھل رہی تھیں' جہاں بندو رہتی تھی۔ اسے پیار کرنے والی بندو' حسین بندو' شرم کو طاق میں رکھے بالکل ننگی بندو۔

ابھی دن چڑھا بھی نہ تھا' کہ ماں نے اسے کندھوں سے جھنجھوڑا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہی کھیتوں کو جوتنا اچھا ہے۔ رات کی سیاہی ابھی سلامت تھی' ستارے بھی چمک رہے تھے۔ اس نے تکئے کے نیچے تہہ کرکے رکھی اپنی قمیض نکال کر پہن لی۔ اس کی نگاہیں ساتھ کی چھت پر پہنچیں۔ بندو بے خبر پڑی سو رہی تھی۔

بیلوں کو ہل میں جوت کر دلیپ سنگھ کھیتوں کی طرف چل پڑا۔ وہ گاؤں کی اندھیری سنسان گلیوں سے گزر کر ستاروں تلے چمکتے اپنے کھیتوں میں آپہنچا تھا۔ اسے تھکان سی محسوس ہو رہی تھی۔ بندو کا خیال اب بھی دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

مشرق کی طرف افق آہستہ آہستہ سیاہ سے سلیٹی ہوتا جا رہا تھا۔ کوئل کی بھید بھری آواز کھیتوں میں گونجنے لگی تھی۔ قریب کے کیکر کے درخت پر کوے بھی آہستہ آہستہ کائیں کائیں کرنے لگے تھے۔

وہ کھیتوں کو جوت رہا تھا' لیکن دل تو کہیں اور ہی لگا ہوا تھا۔ بس ہل کو تھامے ہوئے پیچھے پیچھے چلا جا رہا تھا۔ کھانچے نہ تو سیدھے پڑ رہے تھے اور نہ ہی گہرے۔ شفق کی سرخی میں دیکھا' تو اسے اپنے آپ پر ہی شرم آگئی۔ اس نے اپنے آپ کو منظم کرنے کی سوچی۔ دن میں خواب! بس اب اور نہیں۔ ہل کے نکیلے سرے کو دھرتی میں گہرا گاڑا' بیلوں کو چھڑی کی چوٹ پر زور کی ہانک لگائی۔ بیلوں کو دھکا سا لگا۔ نتھنے پھڑ پھڑاتے' دم ہلاتے ہوئے وہ رفتار پکڑنے لگے۔ دھرتی کو چیرتا ہوا ہل دلیپ کے دونوں پاؤں کی طرف مٹی کے ڈھیلے لڑکھانے لگا۔ ایک خونخوار فیصلے کے ساتھ اس نے

ہل کو زمین میں اور گہرائی تک دھنسا دیا اور دیکھنے لگا۔۔۔ کس طرح ہل کا نکیلا سرا' جیسے زہر آلود ہو کر دھرتی میں سما جانا چاہ رہا تھا۔

سورج اپنی پوری تیزی پر آنے لگا تھا۔ دلیپ نے جوتنا روک دیا۔ بیلوں کو لے کر کنوئیں پر پہنچا۔ کنوئیں پر چھترائے پیپل کے درخت کے سائے میں بیلوں کو کھول دیا۔ کئی بالٹیاں پانی نکال کر جی بھر کر اشنان کیا اور بیلوں پر بھی چھینٹے مارے۔ راستے بھر رستے ٹپکتے بیلوں کو ہانکتے ہوئے گھر پہنچا۔

ماں اس کے ہی انتظار میں تھی۔ تازہ سینکی روٹیوں پر مکھن تیرتا پالک کا ساگ ڈال کر اس نے دلیپ کو تھما دیا۔ ساتھ میں لائی بڑے سے تانبے کے گلاس میں منہ تک بھری لسی۔ دلیپ کو بے حد بھوک لگی تھی' کھانے پر ٹوٹ ہی پڑا۔ ماں پاس بیٹھی پنکھا ہلاتے ہوئے مکھیوں کو ہٹانے میں لگ تھی۔ روٹی اور پالک کو پیٹ میں بھر کر اس نے گلاس میں بھری لسی بھی نگل لی۔ چارپائی پر پڑتے ہی نیند نے اسے گھیر لیا۔ ماں اب بھی پاس بیٹھی اسے پیار بھری نظروں سے سراہتے ہوا کرتی جا رہی تھی۔

دن کا سویا دلیپ دوپہر بھریوں ہی پڑا رہا۔ آنکھ کھلی تو شام گھر آئی تھی۔ پانی کی نالیاں کھولنے وہ اپنے کھیتوں کو چل پڑا۔ اس کے اور اس کے چاچا بنتا سنگھ کے کھیتوں کے درمیان پانی کی ایک نالی پڑتی تھی۔ وہ اس کے کنارے کنارے ہی چلنے لگا۔ چاچا کے کھیتوں کی سینچائی تو کاشت کار ہی کیا کرتے تھے۔ اپنے بھائی کو قتل کرنے کے بعد سے بنتا سنگھ شام کے وقت کھیتوں میں آنے سے کتراتا تھا۔

دلیپ سنگھ اپنے کھیتوں میں پانی کی نالیوں کو کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ کام ختم کرکے وہ ندی کے کنارے آپہنچا۔ ہاتھ منہ دھویا اور کنارے کی گھاس پر بیٹھ کر بہتے پانی میں پاؤں ڈبو کر ماں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

سامنے پھیلی وسیع سپاٹ دھرتی کے پار سورج دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا تھا۔ آدھے چاند کے پہلو میں شام کا ستارہ بھی چمکنے لگا تھا۔ گاؤں کی طرف سے کنوئیں پر بیٹھی باتیں کرتی عورتوں کا شور و غل' کھیلتے ہوئے بچوں کی آوازیں اور کتوں کے مل کر بھونکنے کی آوازیں اب اس تک پہنچنے لگی تھیں۔ دن بھر کی اڑان سے لوٹیں چڑیاں بھی شور مچاتی ہوئی اپنے اپنے گھونسلوں میں جانے لگی تھیں۔ عورتوں کی ٹولیاں بھی کھیتوں میں آکر رفع حاجت کے لئے جھاڑیوں کے پیچھے بکھرنے لگی تھیں۔ آب دست

کے لئے وہ پھرندی کے کنارے آکر جمع ہو گئی تھیں۔

دلیپ کی ماں ٹائم کیپر سے پانی دینے کی باری کا لکڑی کا ٹوکن لے کر آگئی تھی۔ اب دلیپ کی پانی دینے کی باری تھی۔ ٹوکن اسے تھما کر وہ دوبارہ مویشیوں کی دیکھ بھال کے لئے لوٹ پڑی تھی۔ بنتا سنگھ کے کاشت کار پہلے ہی جا چکے تھے۔ دلیپ نے بنتا سنگھ کے کھیتوں کی طرف کے پانی کا راستہ جام کر دیا اور پانی کا رخ اپنے کھیتوں کی طرف موڑ دیا۔ اب وہ کنارے کی ملائم ٹھنڈی گھاس پر پسر گیا اور اپنے جوتے ہوئے کھیتوں میں چھلکتے پانی کو سراہنے لگا ایسا لگ رہا تھا' جیسے چاند کی چھٹکتی چاندنی میں بہتا ہوا سیال چاندی کی طرح چمک رہا ہو۔ پیٹھ کے بل لیٹے وہ آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ گاؤں سے آتی ملی جلی آوازیں رہ رہ کر اس کے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ بنتا سنگھ کے کھیتوں سے آتی عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں بھی اسے سنائی دے رہی تھیں۔ تبھی اچانک چاندنی بھری خاموشی میں جیسے وہ کسی اور ہی دنیا میں منقول ہونے لگا تھا۔

قریب سے ہی آتی پانی کے چھیٹوں کی آواز نے اس کی اونگھ توڑی۔ گھوم کر دیکھا تو ایک عورت کولھوں کے بل بیٹھی آب دست میں مگن تھی۔ صفائی کے بعد اس نے زمین سے مٹھی میں مٹی اٹھا کر ہاتھوں پر رگڑی اور بہتی دھارا میں انہیں دھونے لگی۔ کلی کرکے چہرے پر بھی چلو بھر کر پانی کے چھینٹے مارے۔ اپنی ڈھیلی ڈھالی شلوار کو پاؤں پر ہی پڑا چھوڑ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ کرتے کا سامنے کا نچلا حصہ اٹھا کر وہ منہ پونچھنے کو جھکی۔

دلیپ نے دیکھا' یہ تو بندو ہے! ایک عجیب سی ہوس بھری دیوانگی اس پر چھانے لگی۔ وہ کود کر دوسرے کنارے پر جا پہنچا اور بندو کی طرف دوڑنے لگا۔ لڑکی کا چہرہ قمیض کے آنچل میں چھپا ہوا تھا۔ وہ پلٹ کر پیچھے دیکھ پاتی' اس سے پہلے ہی دلیپ سنگھ نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ گھبرا کر پیچھے پلٹی' تو لمحہ بھر میں ہی اس کا چہرہ دلیپ کے شہوانی بوسوں سے بھیگ گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلنے سے پہلے ہی اس نے اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹ سی دیئے اور نیچے بچھی نرم گھاس پر اسے گرا دیا۔ بندو جنگلی بلی کی طرح لڑ رہی تھی۔ دلیپ کی داڑھی کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر وہ اس کے گالوں کو بے دردی سے نوچنے لگی۔ اس نے اس کی ناک کو اتنی زور سے کاٹا کہ لہو رسنے لگا۔ لیکن وہ جلد ہی پست ہو گئی' اب اور جدوجہد کرنے کی ہمت اس میں باقی

نہیں رہی تھی' ویسے ہی چپ چاپ پڑی رہی۔ اس کی آنکھیں موندھی ہوئی تھیں۔ دونوں آنکھوں سے بہتی پانی کی دھار کاجل کی لکیر کو کانوں تک بہا لے گئی۔ زرد چاندنی میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ دلیپ کے دل میں پچھتاوا جاگ اٹھا۔ بندو کو دکھی کرنے کا ارادہ اس کا کبھی نہیں رہا تھا۔ اپنی چوڑی کھردری ہتھیلیوں سے اس نے بندو کے ماتھے کو سہلایا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ جھک کر پیار سے اس کی ناک پر اپنی ناک رگڑ دی۔ بندو نے اپنی لمبی کجراری آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف سونی سونی نظروں سے دیکھنے لگی۔ دلیپ نے اس کی آنکھوں اور ناک کو دوبارہ ہلکے سے چوم لیا۔ بندو کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا' ایک خلاء---- جسے نہ تو نفرت ہی کہا جا سکتا تھا' نہ ہی پیار۔ بندو کی سونی نظریں اس تک پہنچیں۔ آنسوؤں کی ایک اور باڑ آنکھوں سے بہہ نکلی۔

اس کی سہیلیاں اسے پکار رہی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان میں سے ایک قریب آئی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس نے مدد کے لئے دوسری سہیلیوں کو آواز دی۔ دلیپ سنگھ پھرتی سے اٹھا اور نالے کے دوسرے کنارے کود کر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

"کراؤن بنام دلیپ سنگھ" کے مقدمے کی کاروائی پر جیسے سارا سنگھ پورہ گاؤں ہی امڈ آیا تھا۔ عدالت کا کمرہ' برآمدہ اور سارے کا سارا احاطہ گاؤں کے لوگوں سے بھر گیا تھا۔ برآمدے کے ایک طرف دو پولیس والے ہتھکڑیوں میں جکڑے دلیپ سنگھ کو گھیرے کھڑے تھے۔ قریب ہی اس کی ماں چہرے کو شال کی پرتوں سے لپیٹے اسے پنکھا کرتی کھڑی تھی۔ روتے روتے وہ اپنی ناک پونچھتی جا رہی تھی۔ برآمدے کے دوسرے سرے پر بندو' اس کی ماں اور کچھ عورتیں گھیرا ڈالے کھڑی تھیں۔ بندو بھی روتی جا رہی تھی اور ناک سڑکتی جا رہی تھی۔ سب سے زیادہ کشش کا مرکز بنتا سنگھ اور اس کے یاروں کی ٹولی تھی' جو ہاتھوں میں بانس کے ڈنڈوں کے سہارے جھکے لگاتار بڑبڑانے میں لگے تھے۔ دوسرے گاؤں والوں کے لئے بھی وقت گزارنے کو بہت کچھ تھا۔ کئی ٹھیلے والے سے مٹھائیاں خرید رہے تھے۔ کچھ جنسی کتابوں کے فروخت کنندہ کو گھیرے ایک دوسرے کو ٹھوکے لگاتے ہوئے ہنس رہے تھے اور کچھ نام نہاد قسم کے ماہر کان

سے کان صاف کرا رہے تھے۔

سرکاری استغاثہ کے لئے بنتا سنگھ نے ایک وکیل کر لیا تھا۔ وکیل نے استغاثہ کے سارے گواہوں کو ایک کونے میں لے جاکر ان کی گواہی انہیں رٹا دی تھی۔ وکیل مخالف کے ذریعے پوچھے جانے والے تمام ممکنہ سوالات سے انہیں آگاہ کر دیا۔ اس نے عدالت کے اردلی سے بھی بنتا سنگھ کو ملوا دیا۔ سرکاری وکیل کو اپنے موکل سے نوٹوں کی ایک گڈی بھی دلوا دی تھی۔ انصاف کی مشینری کو پوری طرح تیل لگا دیا تھا۔ دلیپ سنگھ نہ تو اپنی صفائی میں کوئی وکیل ہی مقرر کر پایا تھا' اور نہ ہی کوئی گواہ۔

اردلی نے عدالت کا دروازہ کھولا اور مقدمے کی کاروائی شروع ہونے کا اعلان کیا۔ اس نے بنتا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ دلیپ سنگھ کو سپاہیوں کی نگرانی میں اندر لایا گیا' لیکن اس کی ماں کو اردلی نے اندر آنے سے روک دیا۔ یہ اس کی مٹھی جو گرم نہ کر سکی تھی۔ جب عدالت کے اندر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تو کلرک نے استغاثہ کے بارے پڑھنا شروع کیا۔

دلیپ سنگھ نے بے قصور ہونے کا دعویٰ کیا۔ مجسٹریٹ مسٹر کمار نے استغاثہ سے متعلق سب انسپکٹر کو بندو کو حاضر کرنے کو کہا۔ شال میں چہرہ لپیٹے بندو کٹہرے میں داخل ہوئی۔ اب بھی وہ ناک سنکے جا رہی تھی۔ انسپکٹر نے اس کے والد اور دلیپ کی دشمنی کی بابت پوچھ تاچھ کی' اور اس نے بندو کے کپڑوں کو عدالت میں پیش کیا۔ استغاثہ کی طرف سے کہنے کو اور کچھ باقی نہیں تھا۔ ثبوتوں کے ساتھ بندو کی گواہی مقدمے کو بالکل واضح اور ناقابل تردید ثابت کرتی تھی۔

قیدی کو کہا گیا کہ اپنی صفائی میں اسے کچھ پوچھنا ہو' تو پوچھ لے۔

"میں بیگناہ ہوں' حضور!"

مسٹر کمار مضطرب سے ہو رہے تھے۔ بولے' "تم نے گواہیاں تو سن ہی لی ہیں؟ اگر تمہیں لڑکی سے کچھ نہیں پوچھنا ہے' تو میں فیصلہ سنا دوں۔"

"حضور--- میرے پاس تو کوئی وکیل بھی نہیں ہے۔ گاؤں میں ایسا کوئی دوست بھی نہیں' جو میرے لئے گواہی دے۔ غریب آدمی ہوں' مالک' لیکن میں بالکل بے قصور ہوں۔"

مجسٹریٹ کو اب غصہ آ گیا۔ اس نے وکیل کی طرف رخ کیا' "لکھو' جرح نہیں

ہوئی۔"

"لیکن، حضور۔" دلیپ سنگھ گڑ گڑایا، "مجھے جیل بھیجنے سے پہلے ذرا ایک بار اس لڑکی سے پوچھئے تو سہی، کہ کیا وہ رضا مند نہیں تھی؟ میں اس کے پاس گیا تھا، کیونکہ وہ خود میرے قریب آنا چاہتی تھی۔ میں بے قصور ہوں۔"

مجسٹریٹ نے دوبارہ وکیل کو مخاطب کیا، "لکھو--- ملزم کی طرف سے جرح--- کیا لڑکی اپنی مرضی سے ملزم کے پاس گئی تھی؟" پھر انہوں نے بندو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا، "جواب دو، کیا تم اپنی مرضی سے ملزم کے پاس گئی تھی؟"

بندو صرف روتی گئی اور ناک سنکتی رہی۔ ایک عجیب سا سناٹا عدالت میں چھا گیا تھا، مجسٹریٹ کے ساتھ ساتھ تمام ہجوم بھی اس کے جواب کا بے تابی سے انتظار کر رہا تھا۔

"تم گئی تھی، کہ نہیں؟ جلدی جواب دو۔ مجھے اور بھی کام نمٹانے ہیں۔"

شال کی ان گنت تہوں میں چہرہ چھپائے ہوئے بندو نے جواب دیا، "ہاں جی!"

# دیکھو، کیسے چلتی ہے بھارت کی سرکار

"اچھا یار' بتاؤ تو ذرا کہ ہندوستان کی سرکار کیسے چلتی ہے؟" اندر داخل ہوتے ہی بوکھلائے ہوئے سندر سنگھ نے اپنے دونوں ساتھی سٹینو گرافروں کی طرف سوال اچھالتے ہوئے پوچھا۔ بنگالی بابو گھوش موشائیے نے کچرے کی ٹوکری میں پان کی پیک پچ سی تھوکی اور اپنی دھوتی کی کناری سے ٹھوڑی پر بہتی لار پونچھ کر ایک لفظ میں ہی اپنی رائے دی—— "سو تیے (سچ)"۔

"ہے یو' مسٹر مدراسی۔" شمبھو مورتی کی طرف مڑ کر سندر سنگھ نے حملہ آور آواز میں پوچھا' "وٹ یو سے؟ (کیا کہتے ہو تم)"۔ (سندر سنگھ کی اپنے دیش کے بارے جانکاری صرف پنجاب تک ہی محدود تھی)۔ بمبئی سے جنوب کی طرف رہنے والے تمام اس کے لئے مدراسی تھے۔ شمبھو مورتی بھی اتنے اہم سوال کا جواب جلد بازی میں نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے ٹائپ رائٹر کے "کی بورڈ" سے پھونک مار کر دھول اڑائی اور بڑی بڑی بے احساس آنکھوں سے اس پرجوش سکھ کی طرف دیکھنے لگا۔

"وٹ یو سے؟" سندر سنگھ نے مضطرب ہو کر پھر پوچھا۔ شمبھو مورتی نے سر ہلایا اور بنگالی بابو کی رائے میں ایک لفظ جوڑ دیا' "بالکل سچ!"

"ارے کیا خاک سچ!" کھڑے ہوتے ہوئے سندر سنگھ چنگھاڑا' "اچھا' یہ بتاؤ کہ یہ سیکرٹری' ایڈیشنل سیکرٹری' جائنٹ سیکرٹری' ڈپٹی سیکرٹری وغیرہ وغیرہ کیا جانتے ہیں' کام کے بارے میں؟" اپنے ہی مذاق پر ہنستے ہوئے وہ جاری رہا' "کیا کرتے ہیں یہ؟ بتاؤ؟ یہی

نہ کہ میٹنگیں اٹینڈ کرلیں' چائے کے کپ سڑک لئے' کچھ میمو ڈکٹیٹ کرا دیں اور اپنی میم صاحبوں کے پاس پہنچ کر کہہ دیا کہ "بہت کام کرکے آئے ہیں دفتر سے' بہت بیزی رہے سارا دن!" ہا' ہا' بزی رہے؟ ہم جانتے ہیں نا کہ کتنے بزی رہے؟ کیوں؟"

"ان دونوں نے حامی میں سر ہلایا۔ اور آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ ان کا کہنا غلط نہیں' کیونکہ یہی لوگ بھارت سرکار کا کام چلاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کی پیچیدہ مشینری کیسے چلتی ہے؟ بیرونی دنیا کے لئے جو لال فیتہ شاہی کا مکڑ جال ہے' ان کے لئے وہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ انہیں دفتر شاہی کے اصول' قانون انگلیوں پر رٹے ہوتے ہیں۔ نوٹنگس' مینوٹس اور میمورنڈا کی اہمیت کو یہ جانتے ہیں۔ فائلوں کے ایک افسر سے دوسرے افسر تک بھٹکنے کے رجحان سے یہ واقف ہوتے ہیں۔ ان کا تجزیہ آسان اور احساسات کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اگر ٹائپسٹ اور سٹینو گرافر میٹنگوں کی تفصیلات کو ترتیب سے اور ٹھیک ٹھاک کرکے پیش نہ کریں' تو ان بڑے بڑے افسروں کے ذریعے لئے گئے فیصلے کسی کو سمجھ ہی نہ آئیں۔ اگر یہ ضروری کاغذات کو متعلقہ افسروں کے دستخطوں کے لئے نہ رکھیں تو سرکار کا سارے کا سارا کام ہی ٹھپ ہو جائے۔

کون سا اعلیٰ افسر ہے' جو طریقہ کار کے قوانین اور اصولوں کو اتنی اچھی طرح جانتا ہو گا' جتنی اچھی طرح سے یہ لوگ جانتے ہیں۔ کون ان کی طرح پراسرار طریقے سے وقت پڑنے پر فائلوں کو گم کر سکتا ہے اور دوبارہ وقت آنے پر پیش بھی۔

حیرت کی بات نہیں تھی کہ مسٹر سندر سنگھ' شمبھو مورتی اور گھوش بابو بھارت سرکار کے وسیع سیکرٹریٹ کے تیس ہزار کلرکوں میں سے محض تین تھے' لیکن وہ اپنے آپ کو انتظامیہ کا بنیادی ستون سمجھ رہے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ بڑے بڑے فیصلے تمام افسروں کے ذریعے نہیں' بلکہ اوپر کے کچھ ایک آدھ ہی بڑے لوگوں کے ذریعے لئے جاتے ہیں' لیکن بڑے بڑے محکموں کو چلانے والے اصلی لوگ ان کے طبقے کے ملازم ہی ہوتے ہیں' افسر نہیں۔

آپس میں مشورہ کرکے جب وہ اپنی اہمیت کے بارے ہم خیال ہو گئے تو سندر سنگھ نے گھنٹی بجا کر چپڑاسی کو بلایا' "چائے یا کافی؟" سندر سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا اور پھر خود ہی چپڑاسی کو حکم دیا' "دو چائے اور مسٹر مدراسی کے لئے ایک کافی!

کووک، فٹافٹ!"

آج پہلی بار میں دیر سے آیا۔ جس واقعہ کے باعث سندر سنگھ اتنا مشتعل ہوا تھا۔ اسے اس نے تیسری بار دہرایا، "مجھے کہتا ہے کہ "سندر سنگھ، تم لیٹ آرہے ہو۔ بتاؤ، بھارت سرکار کیسے چلے گی، اگر سب تمہاری طرح لیٹ آنے لگیں؟" میرا دل تو کر رہا تھا کہ کہوں--- "مسٹر، تم تو نہ بولو، تم خود تو گیارہ بجے سے پہلے کبھی نہیں آتے۔" آج پہلی بار تم "پنچوول" ہو رہے ہو!" لیکن یار، تم لوگ تو مجھے جانتے ہو۔ اس کل کے چھوکرے کو میں کیا منہ لگاؤں، میرے منہ کا ذائقہ ہی بگڑے گا، اور کیا؟" وہ بولا، "نو، میرے پاس ابھی ٹائم نہیں ہے، بعد میں بلاؤں گا۔ لیکن اس طرح دیر سے آنا مجھے بالکل پسند نہیں۔" سندر سنگھ نے غصے سے اپنے باس کی نقل اتاری، "آئی ڈونٹ لائق پیپل .بنگ لیٹ۔" وٹ یو سے گھوش بابو؟ ہیں۔"

گھوش بابو فلسفیانہ انداز میں بولا، "اس دنیا میں انصاف نہیں رہ گیا۔"

"ا-بسلیوٹلی نو جسٹس، کوئی انصاف نہیں رہ گیا۔" شمبھو مورتی نے بھی حامی بھری۔

کافی اور چائے پہنچ گئی۔ تینوں ساتھی اپنے اپنے میز اور ٹائپ رائٹر چھوڑ کر کمرے کے درمیان تین کرسیاں جما کر بیٹھ گئے۔ درمیان میں ایک کرسی ٹرے کے لئے بھی لگا لی۔ سندر سنگھ نے چائے اور کافی پیالوں میں ڈالی اور تینوں کام چھوڑ کر آدھے گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔

گھوش بابو کو پڑھنے کا شوق تھا۔ اپنا علم جتاتے ہوئے انہوں نے بتایا، "جانتے ہو، یوروپ میں گیارہ بجے لوگ چائے، کافی یا کوئی سٹرانگ ڈرنگ پینے کے لئے کام روک دیتے ہیں۔ وہ لوگ اسے "ایلے و -لنیس" کہتے ہیں۔"

شمبھو مورتی بولا، "بھئی انگریزی کی یہ کہاوت نہیں سنی--- آل ورک اینڈ نو پلے میکس جیک اے ڈل بوائے؟"

"لیکن۔" سندر سنگھ نے مخالفت کی، "یہ کوئی پلے نہیں ہے۔ یہ کام سے تھوڑا سا آرام ہے۔ گھوش بابو، یہ "ایلے و -لنیس" کتنی دیر کا ہوتا ہے؟"

"تقریباً" آدھا گھنٹہ۔" گھوش بابو نے تصحیح کرکے جواب دیا، "یو سی، ان کے یہاں تو کوئی چپڑاسی وغیرہ نہیں ہوتی۔ نوکر، کک، بیرے بھی نہیں ہوتے۔ اپنی چائے، کافی خود

بناتے ہیں' یا ہوٹل' ریستورانوں میں چلے جاتے ہیں۔"
"کام بالکل رک جاتا ہے؟" سندر سنگھ نے تجسس ظاہر کیا۔
"ہاں' پوری طرح۔"
"ونڈر فل!"
"ہم کو تو" ایلے و 'نسیس' کے لئے چھٹی ہی نہیں دی جاتی۔" شمبھو مورتی نے شکایت کی' "ہم لوگوں کو کلرک ایسوسی ایشن کے سامنے یہ مدعا رکھنا چاہئے۔"
"ہاں' ہم لوگوں کو چائے کے لئے آدھے گھنٹے کا بریک ملنا چاہئے۔ "لیٹ اس سی۔" سندر سنگھ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' "ابھی 45-11 ہوا ہے۔ 45-11 تک چائے کا بریک ہونا چاہئے۔"
شمبھو مورتی نے سرہلایا' "ہاں' یہ تو پاپولر ڈیمانڈ ہو گی۔ میں پروپروز کر دوں گا۔"
فیصلے نے ان کے چہروں پر چمک لا دی۔ سڑکتے سڑکتے وہ چائے پینے لگے۔ سندر سنگھ نے چپڑاسی کو بلایا۔ اس کے دروازے پر نظر آتے ہی تینوں نے اپنے اپنے بٹوئے نکال لئے اور پیسے دینے کے لئے آپس میں ضد کرنے لگے' "نو' نو' آج میری باری ہے۔"۔ "نو' میری باری ہے' تم نے کل دیئے تھے۔" ہمیشہ کی طرح جیت سردار جی کی ہوئی۔ اس نے ساتھیوں کے بٹوئے واپس ان کی جیبوں میں ٹھونس دیئے اور چپڑاسی کو پیسے دے کر باہر کیا۔ اپنی اپنی کرسیاں اٹھا کر وہ پھر اپنے ٹائپ رائٹروں کے پاس پہنچ گئے۔
15-11 بجے تھے' اور قانونی "ایلے و 'نسیس" کا اختتام۔
"ارے بھائی' آج کی خبر کیا ہے؟" ٹائپ رائٹر کے "کی بورڈ" پر پھر پھونک مارتے ہوئے شمبھو مورتی نے پوچھا۔
سندر سنگھ نے گھنٹی بجائی۔ چپڑاسی پھر حاضر ہوا۔
"اوئے' منسٹری کی لائبریری سے اخباریں لے کر آؤ ذرا۔ بولنا' بڑے صاحب کو آدھے گھنٹے کے لئے چاہئیں۔"
پانچ منٹ بعد چپڑاسی اخباروں کا بنڈل لے کر حاضر تھا۔ تینوں نے اپنے اپنے صوبے کے مطابق اخباریں پکڑ لیں۔ تینوں بے تابی سے ان میں آنکھیں گاڑ کر بیٹھ گئے۔ گھوش بابو کا جھکاؤ سیاست کی طرف تھا' اور وہ دنیا بھر کی خبریں پڑھتا تھا۔ اپنے

ساتھیوں کو بھی' ''ورلڈ آ فیئر'' کے بارے کچھ نہ کچھ بتا کر ان کا نکتہ نظر وسیع کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے کچھ خبریں چھانٹیں اور انہیں پڑھ کر سنانے لگا۔ ساتھ ساتھ اپنا تبصرہ اور اظہار رائے بھی دیتا رہا۔ شمبھو مورتی کو بھی اپنے صوبے کی خبریں بہت دلچسپ لگ رہی تھیں۔ پارٹیوں کے چکروں' سازشوں اور پارٹی تبدیل کرنے وغیرہ کے بارے سناتے ہوئے وقفے وقفے سے ''آئی یو یو'' بھی کرتا رہا۔ سندر سنگھ نے پچھلے صفحے سے شروع کیا اور درمیانی صفحے سے آگے نہیں پڑھ پایا' ''واہ' واہ۔'' سندر سنگھ چلایا۔ ابھی گھوش بابو کو مشرق اور مغرب کے تصادموں کی تازہ حالت بیان کرنا باقی تھا۔ شمبھو مورتی بھی ابھی تک اپنے یہاں کے براہمنوں اور غیر براہمنوں کے درمیان تکرار کے بارے نہیں بتلا سکا تھا۔ سردار جی نے درمیان میں ہی بولنا شروع کر دیا' ''ہوم منسٹری نے ڈیفنس منسٹری کے خلاف والی بال میچ جیت لیا۔ آج وہ لوگ لنچ ٹائم میں ہمارے خلاف کھیلنے والے ہیں۔ میں اپنی ٹیم کو فون کرتا ہوں۔''

سندر سنگھ ٹیلی فون کے ساتھ جٹ گیا۔ اس کی منسٹری کے ملازموں نے خبر پڑھی ہوئی تھی۔ لیکن میچ کے بارے تبصرہ اور ہوم منسٹری کی قسمت کے فیصلے پر باتیں تو کرنی ہی تھیں نا؟ ''ایسی منہ کی دیں گے کہ جنم بھر یاد رکھیں گے۔'' ہر دفعہ ٹیلی فون کا چونگا رکھتے ہوئے سندر سنگھ کے منہ سے یہی فقرے نکلتے۔ اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے اس نے کہا' ''تم لوگ بھی چلو۔ میچ دیکھنے۔ یہ بہت ضروری ہے' یار!''

گھوش بابو نے اخبار کو اپنے ٹائپ رائٹر پر رکھتے ہوئے کہا' ''اگر دیر ہو گئی تو؟ تم نہیں جانتے' یہ صاحب لوگ کبھی بھی ٹفن سے واپس لوٹ سکتے ہیں؟''

''نیور بی فور تھری او کلاک مین۔ تین بجے سے پہلے آجائیں تو کہنا۔ جانتے نہیں' کیسے یہ لوگ بزی دکھانے کا ڈھونگ کرتے ہیں۔ لنچ کے لئے ہمیشہ دیر سے جاتے ہیں' تاکہ بیوی سمجھے کہ بہت کام کر کے آئے ہیں۔ چاہے ہی یہاں سے چخ مار کر آئے ہوں۔''

شمبھو مورتی نے حامی بھری۔ اگرچہ اسے کھیلوں میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی' پھر بھی اپنی منسٹری کا جوش بڑھانا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ خاص کر اپنے نزدیکی ساتھی کا' جو اپنی ٹیم کا سہارا تھا۔

وہ سب اپنے اپنے اخباروں سے پھر چپک گئے۔ پونے بارہ بجنے کو آئے تھے۔

سندر سنگھ نے کھیل کا صفحہ پڑھ کر ختم کیا اور دوسرے اہم موضوع کی طرف بڑھا۔ شادی کے اشتہارات۔ جیسے ہی کالم پر نظر پڑی' اس کی آنکھوں میں چمک ابھر آئی' "گھوش بابو' یہ آپ کے واسطے ہے---" بغیر بچوں والی کنواری بیوہ کے لئے بر چاہئے۔" اگر وہ کنواری ہے' تو بچوں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے؟ اس کے کیا معنی ہوئے' بھلا؟"

"ارے' اگر پنجاب کی ہے' تو سب ہو سکتا ہے۔" شمبھو مورتی نے دانت نکالتے ہوئے کہا' "ہمارے یہاں ایسی عورتیں نہیں ہوتیں۔ یہ "ایڈ" دیکھو' ساؤتھ سے ہے"' اور اس نے پورا اشتہار پڑھ کر سنا دیا' "مسٹر سنگھ' اگر تم میرڈ نہیں ہوتا نا' تو اپلائی کر سکتا تھا۔ خالی جنم پتری بھیجو۔ ان کو مالوم نہیں پڑے گا' تمہارا شکل و صورت کے بارے میں۔ ڈرے گا نہیں' وہ لوگ تم سے تمہارا یہ سب بال داڑھی دیکھ کر۔"

"تم لوگ' یار جنم پتری کیوں مانگتے ہو؟ فوٹو کیوں نہیں مانگتے؟" سندر نے پوچھا۔

"شکل و صورت تو خالی اوپر کا بات ہے' اچھی قسمت ہونے سے ٹھیک رہتا ہے نا؟" شمبھو مورتی نے تسلی بخش جواب دیا۔

"اور تم لوگوں کو کتنا "پرجیوڈس" ہے؟ کاسٹ اور سب کاسٹ دیکھے گا۔ اور سارا ٹائم پیسے کا سوچے گا۔ یہ دیکھو' پنجاب والے' "ایڈریس" سب لکھتے ہیں' "کاسٹ اینڈ ڈاوری نو بار"

تینوں ساتھی اپنے اپنے صوبے کی شادی کے رسم و رواجوں کے بارے بات چیت کرنے لگے اور سوچنے لگے' کہ اگر غیر شادی شدہ ہوتے' تو ان کو کتنے بڑھیا بڑھیا مواقع مل سکتے تھے۔ لیکن افسوس' تینوں شادی شدہ بال بچوں والے تھے۔

دراصل آج یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ یہ تو روزانہ کی ان کی مصروفیت تھی۔ بلکہ یہ اتنا اہم موضوع تھا کہ وہ کبھی اس سے چوکتے نہیں تھے۔ ان کی یہ بات چیت دوپہر تک جاری رہتی تھی۔

سندر سنگھ نے اپنا کوٹ اتار کر اپنی کرسی کے پیچھے دیوار سے لگے کیل پر لٹکا دیا۔ اس نے کاغذوں کے درمیان کاربن لگا کر ٹائپ کرنا شروع کیا' "ڈیئر سر' ریفرنس یور لیٹر نمبر---" اور اسے ادھورا ہی چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا' "اگر مجھے کھیلنا ہے' تو کھانا ابھی کھا لینا ہو گا۔ تم لوگ اپنا کھانا والی بال گراؤنڈ میں لے آنا۔"

گھوش اور شمبھو مورتی نے سر ہلا کر حامی بھر دی۔
سندر سنگھ نے گھنٹی بجائی اور چپڑاسی کو سمجھا کر کہا' "دیکھو' اگر صاحب 12-30 سے پہلے بلائیں تو کہنا کہ کہیں باتھ روم وغیرہ گئے ہوں گے۔ بولنا' ان کا کوٹ یہیں میز کے پیچھے لٹکا ہے۔ اگر اس کے بعد بلائیں' تو کہنا' لنچ کے لئے گئے ہیں۔ ٹھیک ہے؟"
چپڑاسی شیطانی سے مسکرایا۔
"ہنستے کیوں ہو؟" سندر سنگھ نے پھٹکارا' "تمہارے واسطے کیا ہم اسی طرح نہیں کرتے؟"

سندر سنگھ اپنے ساتھیوں کو وہیں چھوڑ کر کنٹین کی طرف چلا گیا۔ اس نے کھانے کا آرڈر دیا۔ چپاتیوں کے ساتھ کئی طرح کی سبزیاں منگوائیں۔ آخر میں آئس کریم بھی۔ آرام سے کھانا ختم کیا اور چائے منگوائی۔ چائے کو بھی گلے کے نیچے اتار کر کنٹین کے مینجر کے پاس پہنچ کر پان چباتے چباتے گپ شپ کرنے لگا۔
کنٹین مینجر بھی پنجابی تھا۔ پوچھنے لگا' "سردار صاب' آج کل کون سا شوق فرمایا جا رہا ہے؟"
"شوق؟" سندر سنگھ نے اکھڑ کر پلٹ کر پوچھا' "شوق پورے کرنے کے لئے وقت کہاں ہے یار؟ دن سے لے کر رات تک اسی بہن--- آفس میں لگے رہتے ہیں۔ جب گھر لوٹو تو جسم میں جان ہی کہاں ہوتی ہے؟ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟"
مینجر نے بات ختم کرنا چاہی' "سندر سنگھ جی' کسی کو تو کام بھی کرنا ہی ہو گا نا؟ آپ لوگ نہیں کریں گے' تو اور کون کرے گا؟" سندر سنگھ نے فراخدلی سے قبول کیا' لیکن وہ چاہتا تھا کہ مینجر کو اس کے محنت کش اور مستعد ہونے کے بارے ذرا بھی شبہ نہ رہے۔ آخر مینجر دفتر کی ساری کانا پھوسیوں کا مرکز تھا۔ اس لئے وہ بولا' "کتنے لوگ ہیں' جو دفتر سے باہر بھی کوئی نہ کوئی سائڈ بزنس کرتے ہیں۔ معلوم نہیں' انہیں ٹائم کیسے ملتا ہے؟ مجھے تو کام سے سر اٹھانے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ اپنی آمدنی تو مجھے بھی بڑھانی چاہئے تھی۔ بیوی بچوں کے ساتھ خرچے کتنے ہیں' لیکن میرے پاس وقت ہی نہیں ہے کہ---"
مینجر نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا' "لیکن ہمارے تمہارے جیسے آدمی یہ سب نہیں کر سکتے۔ سرکار تم کو تنخواہ دیتی ہے۔ جو بھی ہو' دفتر کا کام کرنے کے لئے دیتی ہے'

پرائیویٹ بزنس چلانے واسطے تھوڑے ہی۔ یہ تو سراسر بے ایمانی ہو گی' اگر کوئی نوکری میں رہتے ہوئے سائڈ بزنس بھی کرے۔ نہیں؟"

"ہاں یار' اور پھر ٹائم اور طاقت بھی کہاں رہتی ہے' اپنے پاس یہ سب کرنے کے لئے؟"

لوگ لنچ کے لئے آنے شروع ہو گئے۔ ان کی بات چیت میں بار بار خلل پڑنے لگا۔ سندر سنگھ نے مینجر سے ہاتھ ملایا اور رخصت لی۔ ایک بج کر پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ کھیل شروع ہونے میں ابھی پندرہ منٹ باقی تھے۔

وہ دھوپ میں چہل قدمی کرتے ہوئے سیکرٹریٹ کے ساتھ لگے لان کی طرف بڑھنے لگا۔ گروہوں میں بیٹھے کلرک اپنا اپنا کھانے کا ڈبہ نکال کر کھانے میں مشغول تھے۔ کچھ لوگ خوانچے والوں کو گھیرے ہوئے بھی کھڑے تھے۔ لان کے درمیان دو اونچے کھمبوں کے سہارے والی بال کا جال لٹکا ہوا تھا' اور بہت سے کھلاڑی میچ کے لئے مشق کر رہے تھے۔ "ہیلو' ہیلو' کرتے ہوئے لوگوں نے سندر سنگھ کا استقبال کیا' ہاتھ ملائے اور پیٹھ ٹھونکی۔ آخر وہ منسٹری کا سب سے چہیتا شخص تھا اور اپنی ٹیم کا اصلی سہارا تھا۔ ایک سیمی فائنل میچ تھا' اگر وہ فائنل میں جیت گئے تو دھوم دھام سے ہونے والی تقسیم انعامات تقریب میں وزیر صاحب کے ذریعے انعام لے گا۔ سندر سنگھ نے اپنی پگڑی اتاری اور بالوں کو گٹی میں باندھا' اوپر سے رومال لگا کر کس لیا۔ جوتے کھولنے کے لئے وہ اپنی ٹیم کے ساتھ گھاس پر بیٹھ گیا اور کھیل کی چالاکیوں کے بارے صلاح و مشورہ کرنے لگا۔

ٹھیک ایک بج کر تیس منٹ پر میچ شروع ہوا۔ سینکڑوں کلرک' سٹینو گرافر' سپرنٹنڈنٹ وغیرہ چلا چلا کر ان کا حوصلہ بڑھا رہے تھے۔ گھوش بابو اور شمبھو مورتی بھی وہیں بیٹھے تھے۔ بے فکری کا عالم تھا۔ دفتر کا کام چھوڑ کر میچ دیکھنے بیٹھ جانے کے باعث مجرمانہ احساس کا جو تھوڑا بہت جذبہ دل میں آیا تھا' وہ بھی ایک بجے کے بعد سے غائب ہو چکا تھا۔ اب تو ان کا لنچ بریک تھا ہی ایک بجے سے دو بجے تک۔ بریک ٹائم میں وہاں بیٹھنا غیر قانونی نہیں تھا اور پھر باس لوگ بھی تو لنچ کے لئے گھر گئے ہوں گے۔ تین بجے سے پہلے تو کیا ہی لوٹیں گے۔ آرام فرما رہے ہوں گے' گھر پر۔

میچ چل رہا تھا۔ دونوں طرف برابر کے صورت حالات تھے۔ دو گیموں کے بعد میچ

پوری رفتار میں آگیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میچ بند ہوا۔ آخری پانچویں گیم تھی۔
بھارت سرکار کی دو سب سے اہم منسٹریوں کی قسمت کا فیصلہ ان کھلاڑیوں کے ہاتھ میں
تھا۔ سندر سنگھ جو صاف ستھرا کھیل کھیلنے کا عادی تھا' فیصلہ کن لمحات میں اپنا جوہر دکھاتا
رہا۔ وہ شیر کی طرح جھپٹتا اور نیٹ کے اس پار بال کو گولی کی طرح تیزی سے پھینکتا کہ
ہوم منسٹری کی ٹیم کے ہوش اڑ جاتے اور سندر سنگھ کے حمایتی لوگ اتنی زور سے
تالیاں بجاتے اور واہ واہ کرتے کہ سیکرٹریٹ کے اندر اونگھتے لوگ اپنی کھڑکیوں تک پہنچ
جاتے۔ کوئی شک نہیں تھا کہ سندر سنگھ ہی میچ کا "ہیرو" تھا۔ وہ پسینے میں تیر رہا تھا'
لیکن اس کے شکر گزار ساتھی اس سے بغلگیر ہو گئے۔ کچھ نے اس کی داڑھی کو چوم
بھی لیا۔ جیت کی خوشی سے بھرا سندر سنگھ وہیں لان میں ستانے کے لئے لیٹ گیا۔

دونوں ٹیموں کو ٹھنڈے مشروبات دیئے گئے۔ سندر سنگھ کے ساتھیوں نے مٹھائی
کے سٹال پر لے جاکر اس کی آؤ بھگت کی۔ وہ ان کے جذبات کو چوٹ نہیں پہنچانا چاہتا
تھا' اس لئے سب کچھ کھاتا رہا۔ بس دل میں گونجتی گھڑی کی ٹک ٹک ہی اسے بڑا بے
چین کئے ہوئے تھی۔ تین بج کر پینتالیس منٹ پر مداحوں کے گھیرے سے نکل کر وہ
دفتر کی طرف چل پڑا۔ لمبی گیلری میں داخل ہوتے ہی وہ بھی چہرے پر ایسے احساسات
لے آیا' جیسے صبح سے کام کرتے کرتے تھک کر چور ہوا پڑا ہو۔

گھوش بابو اور شمبھو مورتی پہلے سے ہی اپنی اپنی جگہ پر موجود تھے۔ انہوں نے
پرجوش انداز سے اس کا استقبال کیا اور اس کے کھیل کی تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔
انہوں نے اسے بتایا کہ کب سے بار بار ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ سب سندر
سنگھ کو بدھائی دینا چاہ رہے تھے۔ تذبذب کے باعث سندر سنگھ خود اپنے دوستوں کو
اپنے لوٹنے کی خبر نہیں دے سکتا تھا' اس لئے اس کے دونوں ساتھیوں نے دفتر والوں کو
خبر کر دی کہ وہ لوٹ آیا ہے۔ کچھ ہی منٹوں میں کمرہ کلرکوں اور سٹینو گرافروں سے بھر
گیا۔ سب اس کی پیٹھ ٹھونک رہے تھے۔ اس سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ جب وہ لوٹ کر
گئے' تو چار بج چکے تھے۔ سندر سنگھ تھوڑا مضطرب سا نظر آنے لگا۔

"صاحب نے مجھے بلایا تو نہیں تھا؟"

"نہیں' نہیں' ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے۔ صاحب کسی میٹنگ میں گئے ہوئے
ہیں۔ چپڑاسی نے کسی اور سٹینو گرافر کو نوٹ لینے کے لئے کہہ دیا تھا۔"

سندر سنگھ کو ذرا راحت محسوس ہوئی۔ شمبھو مورتی اور گھوش بابو نے کہا' "بھائی' ہم لوگ تم کو چائے لائیں گے۔ کیا کمال کیا ہے' تم نے یار!"
گھنٹی ایک بار پھر بجی۔ چپڑاسی کو پھر چائے اور کافی لانے کا حکم دیا۔ چار بجے کا وقت بھی ہو چلا تھا۔ انگریزوں سے ایک چیز تو ہندوستانیوں نے سیکھی ہی تھی--- شام کے چائے کے وقت کی قدر کرنا۔ اونچے سے اونچا افسر بھی نیچے سے نیچے ملازم کی چائے کے قت میں خلل ڈالنے سے کتراتا تھا۔
شام کے چار بجے کے وقت ہی تو تبادلوں' ترقیوں اور دفتر میں چل رہی بدعنوانیوں کے بارے باتیں کرنے کا موقع ملتا تھا۔ لیکن سندر سنگھ تو آج میچ میں ملی تعریف کے خیالوں میں ہی غوطے لگا رہا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ پچھلے باس نے اس کی خراب رپورٹ دی تھی' یا نئے باس کا اس کے بارے کتنا خراب رویہ تھا۔ نیا باس اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی جب سندر سنگھ نے تبادلے کے لئے عرضی دی تو اس نے "کین ناٹ بی سپئیرڈ" لکھ کر اس کا تبادلہ رکوا دیا تھا۔ جب انسان خود کامیاب ہوتا ہے' تو وہ لوگوں سے حسد کرنا چھوڑ دیتا ہے' اور اس کے بارے اس کے دل میں اچھے خیالات آجاتے ہیں۔ دوپہر کے میچ میں ملی کامیابی نے سندر سنگھ کے دل میں اپنے اعلیٰ افسران کے بارے سارا ملال دھو دیا تھا۔
شمبھو مورتی نے بھی کافی پیتے پیتے کہنا شروع کیا' "میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ سرکاری نوکری میں ترقی کا راستہ بڑا آسان ہے' بھائی! صرف اپنے اوپر والے باس کو خوش رکھو اور باقی سب بھول جاؤ۔ ترقی کا کام اور قابلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ جو باس کہے اس کو صرف "یس سر' یس سر" کہہ کر مانتے رہو۔ دن تہواروں پر اس کے گھر مٹھائیاں اور پھولوں کے ہار لے کر جاؤ۔ بس دیکھو' تمہیں "اے پلس" رپورٹ نہ ملے تو کہو! تب کوئی تمہیں چھو بھی نہیں سکے گا۔ پرموشن پر پرموشن ہوتی جائے گی۔ ارے' اگر چاہو تو اسی طرح تم انڈر سیکرٹری تک بھی بن سکتے ہو۔" خیر' انڈر سیکرٹری بننے کے خواب دیکھنا تو کسی سٹینو گرافر کی اہم خواہش کی انتہائی حد سے بھی بڑھ کر تھا۔
"مسٹر مدراسی' یہ میں تو کبھی کر ہی نہیں سکتا۔" ___ سندر سنگھ نے فخریہ انداز میں کہا۔ بیچارہ بھول ہی گیا تھا کہ اپنے ان دونوں ساتھیوں کی رائے سے' ان کی جانکاری میں ہی ایسا وہ کئی بار کر بھی چکا تھا۔ اس نے پھر دہرایا' "نیور' کبھی نہیں'

کیوں' کیا کہتے ہو گھوش بابو؟"

گھوش بابو نے تائید میں سر ہلایا کہ وہ تینوں دوست دوسروں کی طرح ایسا کرکے اپنے آپ کو کبھی نیچے نہیں گرا سکتے۔ اگر کام اور قابلیت کامیابی کی پہچان تھی' تو دنیا میں اسی کے بل پر کسی سے بھی سب کے سامنے ٹکراؤ سے نہیں چوکیں گے۔ اس بات پر حامی بھر کر تینوں نے آپس میں ہاتھ ملائے اور گھر جانے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ پورے پانچ بجے تھے۔ دفتر بند ہونے کا یہی وقت تھا۔

سندر سنگھ نے اپنی سائیکل اٹھائی اور سیکرٹریٹ سے نکل کر اس سڑک پر مڑ گیا' جس پر کئی سائیکل سواران محلوں کی طرف بڑھ رہے تھے' جہاں بڑے کنبوں اور کم تنخواہ والے کلرک رہتے تھے۔ سب ایسے تھکے معلوم پڑ رہے تھے' جیسے دن بھر سخت محنت کرکے لوٹ رہے ہوں۔ سندر سنگھ تو اور بھی زیادہ۔ وہ اکثر گھر جاتے ہوئے سڑک کے کنارے دکان لگا کے بیٹھے کنجڑوں سے سبزی وغیرہ خرید کر لے جاتا تھا۔ لیکن آج وہ ویسے ہی بے حوصلہ انداز سے ادھر سے گزر گیا۔

گھر پہنچنے پر ہمیشہ کی طرح اسی طریقے سے استقبال ہوا۔ اس کا پانچ سال کا لڑکا اسے دیکھتے ہی دوڑا آیا اور اپنے بھاپا جی کی سائیکل پر بیٹھ کر گھومنے کی ضد کرنے لگا۔ آج سندر سنگھ نے اسے جھڑک کر الگ کر دیا۔ بیوی کی طرف بھی نہیں دیکھا اور آنگن میں چارپائی پر جاکر نڈھال ہو گیا۔ اس کی تین سال کی لڑکی اس کے پیٹ پر جڑھ کر کودنے لگی۔ آج سندر سنگھ نے اسے بے دلی سے نیچے اتار کر بھگا دیا۔ بچے ڈر کر ماں کے پاس رسوئی میں چلے گئے۔

"بہت تھک گئے ہو کیا؟" بیوی نے پوچھا' "آج کیا دفتر میں بہت زیادہ کام تھا؟"

"کام تو ہر دن ہی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ تو تو عورت ہے نا؟ گھر میں بیٹھی رہتی ہے۔ تو کیا جانے کہ بھارت سرکار کیسے چلتی ہے' اگر ہم لوگ کام نہیں کریں گے تو؟"
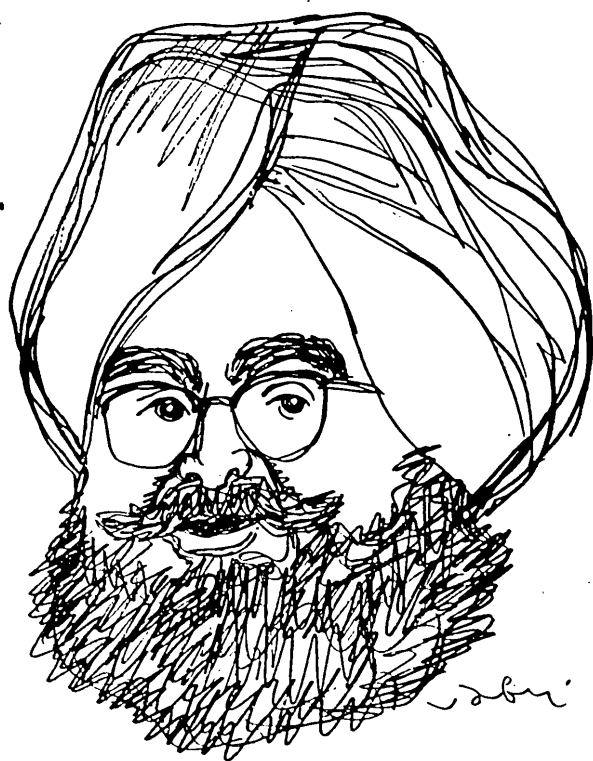
# جب سکھ، سکھ سے ملتا ہے

جب ایک سکھ دوسرے سکھ سے ملتا ہے' تو وہ کہتا ہے--- ''ست سری اکال۔''
یعنی ''خدا حقیقت ہے۔'' اکثر سکھ یہ بھی اعلان کرتے سنے جاتے ہیں کہ ''واہ گورو جی کا
خالصہ۔'' یعنی ''سکھ خدا کے چنندہ ہیں۔'' اور دوسرے اس سے بھی زیادہ جوش سے
اسے مکمل کرنے میں ان کا ساتھ دیتے ہیں--- ''واہ گورو جی کی فتح۔'' یعنی ''ہمارے
خدا کی جیت ہو۔'' پہلے یعنی ''ست سری اکال'' کے نام پر تعظیم کی یہ دوسری صورت
ہی تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ اسکی وجہ واضح ہے۔ صرف یہ کہنا کہ ''خدا
حقیقت ہے'' تو بالکل ویسے ہی بے موقع لگتا ہے' جیسے یوروپ کے لوگوں کا وقت سے
پہلے ''گڈ'' لگانے کا اصول۔ دوسری صورت اس سے آگے جاتی ہے۔ یہ حقیقت کو بھی
ظاہر کرتی ہے اور امید کو بھی۔ اس بات پر تو کسی بھی سکھ کو شبہ نہیں ہے کہ وہ خدا
کے منتخب کئے ہوئے ہیں۔ گورو نے خود انہیں' ''خالصہ'' یعنی ''چنندہ'' کہا ہے۔ اور
اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدمی خدا کی فتح کی ہمیشہ آرزو کرتا رہے۔

اگرچہ سکھ ٹھیک ہی اپنے آپ کو ''چنندہ'' محسوس کرتے ہوں گے' لیکن ایسی اور
بھی ذاتیں ہیں' جو اپنے آپ کو چنندہ سمجھتی ہیں۔ اور بھی ایسے ممالک ہیں' جو خود کو
''اے ون'' کہتے ہیں۔ ایسے فرقے بھی کم نہیں' جو خود کو دھرتی کا ''حاصل'' ہی سمجھتے
ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان میں ہی دوسرے فرقے سکھوں کو ''عجیب و غریب
جانور'' کہہ کر چھوٹا کرتے رہتے ہیں۔ سکھوں کا مذاق بنانے والی ایسی کتنی ہی کہانیاں ان

میں مقبول ہیں۔ سکھ اس طرح کی مسخری پر زیادہ توجہ نہیں دیتے اور اپنی شاہانہ اہمیت کو برقرار رکھتے ہیں' جو ان کے روزمرہ کے تکیہ کلام میں عام جھلکتی ہے۔ ایک اکیلا سکھ اپنے آپ کو سوا لاکھ کے برابر سمجھتا ہے' یعنی ایک پوری کی پوری فوج کے برابر۔

سکھ صرف ایک نیم پختہ جنگجو ذات ہی نہیں ہے۔ لڑائی کے میدان میں جیتے تمام وکٹوریہ اور ملٹری کراسوں کے باوجود وہ درحقیقت امن پسند لوگ ہیں۔ سکھ فرقہ ہی ایک ایسا فرقہ ہے' جس نے سب سے پہلے ایک سیاسی ہتھیار کی صورت میں ستیہ گرہ' کی طاقت کو ثابت کیا تھا' اور تضاد دیکھئے کہ وہ ہی پہلے لوگ تھے' جنہوں نے برطانوی حکومت کے بخلاف منظم بغاوت کا آغاز کیا تھا۔ ایک اور چیز جو انہیں دوسرے لوگوں سے الگ بتاتی ہے' وہ ہے' ان کا لیڈر بننے کا جوش۔ اگرچہ تعداد میں وہ تقریباً" ایک کروڑ اسی ہزار ہوں گے' لیکن دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو' جہاں سکھ نہ ہوں۔ شمالی چین سے لے کر ترکی تک تمام ممالک میں سکھ پہرے دار' سکھ پولیس اور سکھ ٹیکسی ڈرائیور آپ کو دیکھنے کو مل جائیں گے۔ آسٹریلیا' جنوبی افریکہ' امریکہ' کینڈا اور ترکی وغیرہ میں تو سکھ کسان اور کاریگر بھی دیکھنے کو ملیں گے۔ یوروپ کے تقریباً" ہر ایک ملک میں سکھ ڈاکٹر' سکھ پھیری والے اور سکھ نجومی آپ کو ملیں گے۔

سکھ لوگ کوئی بھی دھندہ اپنانے میں نہیں ہچکچاتے۔ ایسا کوئی اصول نہیں ہے' کہ وہ نسلی یا موروثی دھندے کو ہی اپنائیں۔ پنجاب کا ایک کسان بمبئی میں جاکر مہاجن کا کام بھی کر سکتا ہے' یا مشرقی افریکہ میں جاکر بڑھئی بن سکتا ہے۔ کیلیفورنیا میں پھل چننے والا یا پھر کینڈا میں لمبرجیک ہی سہی۔ اگر ضرورت پڑے تو وہ مستقبل بتانے والے پتے نکالنے کا دھندہ کر لیتا ہے' نہیں تو اپنے پوربی لباس میں میلوں' محفلوں میں عورتوں کے ہاتھوں کو پڑھنے کا دھندہ بھی برا نہیں سمجھتا۔ اگر یہ سب بھی ناکام رہے تو اپنے طاقتور جسم کا بھی فائدہ اٹھانے سے وہ نہیں ہچکچاتا۔ قوت برداشت آزمانے کا دھندہ ہی سہی۔ اسی سے یاد آئی' نرنجن سنگھ کے ساتھ میری ملاقات--- نرنجن سنگھ' جو پنجاب میں کسانی کرتے کرتے شنگھائی جا پہنچا تھا۔ وہاں کافی عرصہ کسی کے گھر نوکر کا کام کرتا رہا' پھر سان فرانسسکو میں پھل چننے والا بنا' وینکور میں اکاؤنٹنٹ اور آخر کار ٹورنٹو میں آکر پہلوانی کرنے لگا۔ میں اسے ٹورنٹو میں ہی ملا تھا۔

کئی دنوں تک میں اس کا نام اخباروں اور ہوڈنگ سائنوں میں پڑھتا رہا تھا۔ کینڈا

کے پہلوانوں میں اس کا خاصہ نام تھا اور اس وقت وہ مرجوکی نام کے کسی پہلوان سے کشتی لڑنے والا تھا۔ مرجوکی پولینڈ کا رہنے والا تھا' جو کبھی فلموں میں بھی کام کر چکا تھا۔ نرنجن سنگھ کو لوگ ننجو عرف ویلن کہہ کر پکارتے تھے اور مرجوکی کو "آئرن مائیک۔" یعنی "لوہ مائیک۔" یہ کشتی کافی اہم لگ رہی تھی۔ ویسے بھی ننجو مجھے ایک دلچسپ کردار معلوم ہوا۔ میں کشتی دیکھنے کے لئے کشتی گاہ میں چلا گیا۔

وہاں کا "میپل لیف گارڈن ایڈیٹوریم" تقریباً" بیس ہزار کینڈین شہریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب میں اپنی ٹکٹ لینے گیا تو دو گٹھیلے گھوڑ سوار پولیس مین میرے پاس آئے اور دوستانہ انداز میں مجھے خبردار کرنے لگے' "خبردار رہنا!" وہ مجھے اپنی سیٹ تک پہنچانے آئے اور ان میں سے ایک گلیارے میں کھڑا ہو گیا۔

تھوڑا گڑگڑانے کے بعد مائیکروفون دھاڑا' "اٹینشن پلیز! برائے مہربانی توجہ دیں۔ اب ہم بھارت کے نرنجن سنگھ اور ہالی وڈ' کیلیفورنیا کے "آئرن مائیک" مرجوکی کے درمیان کشتی کا آخری دور دیکھیں گے۔ وقت--- بیس منٹ۔ ایمپائر--- سٹیو بورمین۔"

جیسے ہی لمبا' چھریرا پولینڈ کا رہنے والا مرجوکی گلیارے سے گزرا' تالیوں کی گڑ گڑاہٹ سے ایڈیٹوریم گونج اٹھا۔ اپنے مداحوں کی اس نے جھک کر تعظیم کی اور اکھاڑے میں داخل ہو گیا۔ پیچھے پیچھے نہ جانے کتنے مداح اپنی اپنی آٹوگراف بک لے کر بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بھارتی پہلوان داخل ہوا۔ زرد پگڑی اور سبز ڈریسنگ گاؤن میں نرنجن سنگھ کو دیکھتے ہی ہجوم نے سیٹیاں بجانا اور اس کو بے حوصلہ کرنا شروع کر دیا۔ اپنے ایسے سواگت سے لاتعلق وہ اپنے کونے میں جا پہنچا۔ اس نے اپنی پگڑی اتاری اور مسلمانوں کی طرح مکہ کی طرف منہ کرکے دعا کے لئے جھک گیا۔ اب اس نے کپڑے اتارنے شروع کئے۔ نرنجن سنگھ تھوڑا سا ناٹا اور گٹھیلا سا تھا۔ اس کے بھورے پٹھے باہر کو ابھرے ہوئے تھے۔ چھاتی بالوں سے بھری تھی۔ اکھاڑے کے درمیان کھڑا ایمپائر اس سے باتیں کر رہا تھا۔

کشتی شروع ہوئی۔ نرنجن سنگھ واقعی ہی کینڈا کی کشتی دنیا کا طاقتور پہلوان تھا۔ اس نے بدتہذیب آٹوگراف چاہنے والوں کو دھتکار کر دور کر دیا اور کچھ لڑکوں کو' جو اس کا منہ چڑا رہے تھے' دو چار ہاتھ بھی جڑ دیئے۔ اکھاڑے میں اس نے مخالف کی آنکھوں

میں انگلیاں گھسیڑ دیں' اس کے بال نوچ ڈالے اور دانتوں سے کاٹ کھایا۔ دراصل اس نے ایک ایک کرکے کشتی کے تمام اصولوں' قانونوں کو توڑ ڈالا۔ ہر ایک نے اسے ایسا کرتے دیکھا' سوائے ایمپائر کے۔ اور لگتا تھا کہ ان سب باتوں پر توجہ دینا اس کا کام نہیں تھا۔

"یہ سب دکھاوا ہے' نقلی' پونو۔" میرے پڑوسی نے مجھے بتایا' "دراصل ننجو میمنے کی طرح منکسر ہے۔ ایک بار ملنے سے ہی معلوم ہوتا ہے' کہ کتنا اچھا آدمی ہے۔"

وہ سب جانتے تھے کہ یہ سب دکھاوا ہے' پھر بھی معلوم نہیں' وہ کیوں اس طرح جذباتی ہوئے جا رہے تھے۔ جب ننجو نے مرجوکی کا بازو پکڑ کر مروڑا' تو سب کے سب "نو' نو" کہہ کر چلانے لگے۔ لیکن جب مرجوکی نے ننجو کو اپنی بغل میں دبا کر تڑ کڑانا شروع کیا' تو وہ چیخ رہے تھے' "مار ڈالو اس حبشی کو!"

تو اس طرح تقریباً" پندرہ منٹ تک کشتی چلتی رہی۔ لاؤڈ اسپیکر چلایا' "ابھی پانچ منٹ اور باقی ہیں۔"

میرا پڑوسی ذرا تن کر بیٹھ گیا' اور مجھے ٹھوکا لگا کر بولا' "اب نقلی والی ختم ہوئی' دیکھنا' اصلی کشتی تو اب شروع ہو گی۔"

کھینچا تانی میں ننجو نے دبلے پتلے مرجوکی کو' جو گزشتہ پانچ منٹوں سے اس کی چھاتی پر چڑھ کر بیٹھا ہوا تھا' اٹھا کر نیچے پٹک دیا۔ قاتلانہ غراہٹ کے ساتھ وہ مرجوکی پر ٹوٹ پڑا اور اس کے سر کو اپنی رانوں کے درمیان دبا کر اس کے بازو مروڑنے لگا۔ یہ پکڑ اس کی "کوبرا پکڑ" کے نام سے مشہور تھی۔ ایک ساتھ اس نے اپنے شکار کا سر پچکا دیا اور گلا دبا دیا۔ اکھاڑے میں مکمل خاموشی چھا گئی۔

ایک کرخت آواز گونجی' "مار دے سالے کو!" جوش میں میں بھی اپنے اکیلے ہم وطن کے سر میں سر ملا کر چلایا' "مار دے!" میرے سر پر فوراً" ہی سگریٹ کی خالی ڈبیوں اور کاغذوں کے گولوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ کوئی بیس ہزار آوازیں ایک ساتھ چلائیں' "شٹ اپ!"

میرا پڑوسی گھبرا سا گیا۔ بولا۔۔۔ "بہتر ہے' تم ذرا خبردار رہو۔ لوگ یہاں ذرا زیادہ ہی مشتعل ہو جاتے ہیں' یو نو!" پولیس والا بھی پاس آکر بولا' "مسٹر' بہتر ہے' خاموش بیٹھو' اگر گھر جانے کا ارادہ ہے تو۔"

ہجوم اپنی سیٹوں سے اٹھ کر اکھاڑے کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔ ایک عورت دوڑ کر گئی اور اس نے اپنے سگریٹ کا جلتا ہوا سرا ننجو کی ایڑی میں لگا دیا۔ لیکن ننجو اپنے شکار کو چھوڑنے والا نہیں لگ رہا تھا۔ تماشائیوں کو اپنی سیٹوں پر واپس بھیجنے کے لئے پولیس دوڑی آئی اور کشتی کے اکھاڑے کے چاروں طرف گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر تک مرجوکی نے جدوجہد کی۔ پھر وہ کراہنے لگا اور ہمت ہار گیا۔ ریفریوں نے کشتی روکی اور فاتح کی صورت میں ننجو کا ہاتھ اونچا کیا۔ ہجوم نے سیٹیاں بجائیں اور اپنا غصہ جتاتے ہوئے ننجو کی طرف بڑھا۔ تقریباً" آدھا درجن ہٹے کٹے گھوڑ سوار پولیس مین پہلوان کو گھیر کر کھڑے ہو گئے اور اسے بچا کر اس کے ڈریسنگ روم میں لے گئے۔

پندرہ بیس منٹ بعد' جب ہجوم بکھر گیا اور داڑھی اور پگڑی والے سکھ کے لئے کوئی خطرہ نہ رہا' تو میں ننجو کی زندگی سے متعلق کچھ حقائق کی جانکاری لینے اس کے ڈریسنگ روم میں جا پہنچا۔ ضرورت سے زیادہ گرم اس کمرے میں تقریباً" ایک درجن سے بھی زیادہ ٹورنٹو کے مشہور پہلوانوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ وہ سب آپس میں دوست لگ رہے تھے۔ ننجو اور مرجوکی بھی پیار سے ایک دوسرے کے پیٹ میں مکے مارتے ہوئے فحش انداز سے قلبی تعلق ظاہر کر رہے تھے' "یو سن آف این گن۔" "یو سن آف اے بچ۔" وغیرہ وغیرہ۔

ننجو نے مجھے دیکھا اور اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا' "ارے یار' دیکھو کون آیا ہے۔ میرے اپنے دیش کا رہنے والا--- میرا اپنا ہم وطن---"

میں نے اپنا تعارف کرایا اور سب سے باری باری ہاتھ ملایا۔ ننجو کی انگریزی کی لغات صرف' "جیرتز" اٹس' گڈ ٹوسی یو" تک ہی محدود رہ گئی' اور وہ خالص دیہاتی پنجابی پر اتر آیا۔

"یار میں تاں ایناں ساریاں نوں ا یکلاں ہی چت کر سکدا سی۔ پر میرا مینجر کرن نئیں دیندا۔ مینوں ہار مانی پیندی اے۔ مینوں ولین بننا پیندا اے۔ ہور کئی بار فاؤلنگ واسطے ڈسکو الیفائیڈ ہونا پیندا اے۔ کراں کی؟" اور پھر خاصے ہندوستانی انداز میں اپنے پیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا' "سب اسی پاپی پیٹ کے واسطے۔ لیکن جب میں کافی پیسہ کما لوں گا تو آپ کو بتاؤں گا کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں نے ان سب کو چت کر کے نہ رکھ دیا تو--- تو پھر ہم اپنے ہوشیار پور کو واپس جائیں گے' اپنے کھیتوں کو جوتیں

گے۔ میں اپنی گھر والی کو اپنا گاؤں دکھانا چاہتا ہوں۔" اس نے ہجوم بھرے اس کمرے کا نظارہ لیا اور اپنی گھر والی کو آواز لگائی۔ سنہرے بالوں والی ایک گوری میم پہلوانوں کے گھیرے سے نکلی اور اپنے سونے منڈھے دانتوں کی بتیسی نکال کر ہنسنے لگی۔ اس نے مجھے زور سے "ہاؤ ڈو یو ڈو" کہہ کر تعظیم کی۔ اس دوران وہ خاموشی سے چیونگم بھی چباتی جا رہی تھی۔

"اب یہ سکھ ہے۔ اس کا نام مہندر کور ہے۔ میں نے اسے تھوڑی بہت پنجابی سکھا دی ہے۔" پھر وہ اپنی بیوی سے بولا، "بے بی، ٹیل دا جنٹلمین، وٹ آئی ٹاٹ یو۔ (ان دوست کو بتا دو تو جو میں نے تمہیں سکھایا تھا)"

سنہرے بالوں والی میم نے اپنا چیونگم تھوکا۔۔۔

"واہ، گورو جی کا خالصہ!۔۔۔ واہ، گورو جی کی فتح!"

# مسٹر کنجوس اور ان کا کرشمہ

کسی نے کرشن جی سے پوچھا کہ ''مہاراج' بتایئے تو دنیا کا سب سے بڑا کرشمہ کیا ہے؟'' مسٹر کنجوس نے اپنے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس گھماتے ہوئے کہا اور خود ہی مہاراج کرشن کا جواب بھی بتانے لگے' ''کرشن جی نے کہا' ''سب سے بڑا کرشمہ ہے کہ اگرچہ انسان جانتا ہے کہ اس کی موت لازمی ہے' پھر بھی وہ موت کے بارے کبھی نہیں سوچتا۔'' گلاس کی وہسکی ایک ہی گھونٹ میں گلے کے نیچے اتار کر وہ خالی گلاس میں جھانکنے لگے۔

مسز کنجوس نے بات آگے بڑھائی' ''میرے خاوند تو ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ بھیا' دھن دولت کو ہم اپنے ساتھ تو اوپر لے کر جانے والے نہیں' اس لئے یہیں پر کھا پی' اڑا کر موج مستی کرو۔''

اس نے بھی اپنے گلاس کی وہسکی غڑپ لی' اور میری طرف تائید کی توقع کرتی ہوئی نظر پھینکی۔ ان کا پہلا پیگ میرے توسط سے تھا۔ دوسرے کے لئے بھی میں نے آرڈر دے دیا۔ اور دیتا بھی کیوں نہ؟ اپنا روپیہ پیسہ میں اوپر تو لے کر جا نہیں سکتا تھا۔ اس لئے ہم سب نے دوسرا پیگ پیا اور پھر تیسرا۔ بل آیا' میں نے دستخط کر دیئے۔ کنجوس جوڑا کوچ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

بڑی گرمجوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسٹر کنجوس نے کہا' ''بھئی' آپ ہمارے یہاں آیئے' اور ہمارے ساتھ کھانا کھایئے۔''

''ہاں' ہاں' جب چاہو آجاؤ۔ جو دال روٹی ہم کھائیں گے' آپ بھی کھانا ہمارے

ساتھ۔ مسز کنجوس نے بھی خاوند کا ساتھ دیا۔"

کتنا بے جا لگتا ہے نا؟ ایسے فیاض شخص کا اس طرح کا نام؟ انجان' ناواقف کو بھلا کون کھانے پر بلاتا ہے؟ آج سے پچاس سال پہلے کی بات ہے اور گزشتہ پچاس سالوں سے مجھے دال روٹی کھانے کی ایسی سینکڑوں دعوتیں مل چکی ہوں گی' لیکن معلوم نہیں کیوں' میں کبھی ان کا فائدہ اٹھا ہی نہیں پایا۔ جب کہ کنجوس میاں بیوی میری دال روٹی میں حصہ بٹوانے کئی بار آتے رہے۔ بڑا سمجھدار جوڑا تھا۔ اسی وقت آتے تھے' جب ہم ڈنر سے پہلے کی شراب پی رہے ہوتے۔ وہ "ون فار دا روڈ" تک رکے رہتے۔ تب تک ڈنر کا وقت ہو چکا ہوتا۔ تو "گھر پر کھانا تیار ہے" کے باوجود مسز کنجوس کو نوکر کو فون کرنا پڑتا کہ وہ آج باہر کھا کر لوٹیں گے۔

اگرچہ کنجوس جوڑے کے گھر کھانا کھانے کا موقعہ مجھے نصیب نہیں ہو سکا' پھر بھی میں ان کے کھانے پینے اور دوسری عادتوں کے بارے اچھی طرح جان گیا تھا۔ ایک آدھ چپاتی ہی تو وہاں کھا آتا؟ اس میں کیا رکھا تھا؟ اپنے خیالات اور ذہنیت کا کتنا نفیس کھانا وہ مجھے کراتے رہتے تھے۔

اپنی پہلی ملاقات کے بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بھی گولف کلب کے ممبر تھے۔ وہ باقاعدگی سے کلب آتے تھے۔ پھر بھی میں نے انہیں پہلے کبھی وہاں دیکھا کیوں نہیں؟ لیکن دیکھتا کیسے؟ میرا واسطے کلب جانے کا مطلب تھا' گولف کا ہرا بھرا میدان اور ان کے واسطے اس کا مطب تھا کلب کا "بار" یعنی مے خانہ۔ مجھے اپنے پاس بلا کر کنجوس صاحب نے اپنی فیاضی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا' "کم ایلانگ اینڈ جائن اس۔ کیا ڈرنک لو گے یار؟"

"آپ جو بھی لے رہے ہیں' لے لوں گا۔" کہنے کے بعد ہی مجھے معلوم ہوتا کہ انہوں نے کبھی کچھ بھی منگایا ہوا نہیں تھا۔

میں نے پوچھا' "پر ہیپس اے سمال بیئر۔ بیئر چلے گی۔ آپ کیا لیں گے؟"

"آئی ڈونٹ مائنڈ---" شرماتی ہوئی سی مسز کنجوس بولیں۔

بیرا آیا اور کنجوس صاحب نے آرڈر دیا' "صاحب کے لئے ایک بیئر' میم صاحب کے لئے چھوٹی وہسکی' ہمارے لئے بڑا۔"

ڈرنک آئی۔ سکاچ کی چسکیاں لیتے ہوئے کنجوس میاں بیوی مجھے بتاتے رہے کہ

کتنے لوگوں کو انہوں نے اپنے گھر دعوتوں میں بلایا اور کتنے ان کی شراب پی پی کر "آوٹ" ہوئے۔ "بھئی اگر ڈرنک آفر کرو تو کھلے دل سے کرنی چاہئے۔" اپنی پتلون کی گیلیسوں میں انگوٹھے پھنسا کر کنجوس صاحب کہتے' "آج کل تو جو وہسکی لوگ دوسروں کو سرو کرتے ہیں' اس سے تو میں ٹومیٹو جوس پینا زیادہ پسند کروں گا۔ ارے سوڈے کے گلاس میں انڈین وہسکی کی دو چار بوندیں چھڑک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیو---"

میں نے حامی بھری اور جوش و خروش سے حامی بھرنے کے بعد پھر سکاچ کے دو ڈبل پیگوں اور بیئر کا آرڈر کیسے نہ دیتا؟ مسٹر کنجوس نے تھوڑا نخرہ دکھایا' "میں ویسے تو زیادہ نہیں پیتا' لیکن اگر آپ زور دیتے ہیں تو---"

میں نے زور زیادہ دیا تھا۔ مسز کنجوس خاوند کی فراخدلی کی توضیح آگے بڑھانے لگیں۔ راج کے دنوں کی باتیں انہیں یاد آنے لگیں' جب لوگ کھلے دل سے آؤ بھگت کرتے تھے۔ وہ بولیں' "مجھے یاد ہے کہ 1930ء میں یہ کلب کیسا تھا۔ ہر رات تقریباً درج بھر پارٹیاں ہوتی تھیں۔ کیوں' ڈارلنگ؟ ہر ہفتے کم از کم ایک یا دو پارٹیاں تو ہم لوگ ہی دیتے تھے۔"

کنجوس صاحب نے ہاں میں ہاں ملائی' "اب" مسز کنجوس چالو رہیں' اب تو کوئی کسی کو پوچھتا ہی نہیں۔ بس' سب چاہتے ہیں کہ انہیں کو کھلایا پلایا جائے۔ اٹ از آل اے ون وے ٹریفک۔ آج کل جیسے جیسے لوگ کلب آتے ہیں' ان سے تو مکس کرنے کا بھی جی نہیں چاہتا۔ ہمیں تو اب خبر ہی نہیں کہ یہاں کون کون آتا جاتا ہے۔ بس ایک آدھ پیگ پیتے ہیں اور گھر چلے جاتے ہیں۔"

مسٹر کنجوس نے اور پھر میں نے سر ہلا دیا۔

میں نے دیکھا بیرا کیشئر سے بل بنوا رہا تھا۔ عین موقع پر کنجوس صاحب "ٹائلٹ" کی طرف روانہ ہوئے۔ بیرا آیا اور مجھے ڈرنک کے دونوں دوروں کے بلوں پر دستخط کرنے پڑے۔ مسٹر کنجوس واپس لوٹے تو بیرے کو بلا کر پوچھنے لگے' "وٹ' تم نے دونوں راؤنڈوں کا بل سائن کرا لیا؟" لیکن لمحہ بھر میں ہی میری ہڑبڑاہٹ کے لئے مجھے معاف کرتے ہوئے بولے' "اچھا' کوئی بات نہیں' اگلی بار ہم لوگ ہی سائن کریں گے۔ یہ پکا رہا۔ تو یار' گھر آؤ نہ کبھی؟"

"اور جو روکھی سوکھی دال روٹی ہم کھائیں گے، آپ بھی--- شریمتی بھی بول پڑیں۔"

اگلی بار کلب میں ملے تو پھر کچھ ایک پیگ سکاچ کے چلے۔ بیرا بل لے کر آیا تو کنجوس جی ایک ضروری ٹیلیفون کرنے کھسک گئے۔ تیسری بار ایک ساتھ پینا ہوا تو بل کے پہنچنے پر کنجوس صاحب کسی دوست کے ساتھ گپ شپ کرنے میں اتنے مشغول کہ ادھر ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔

میں بھی کمینگی پر اتر آیا اور کنجوسوں سے کنی کترانے لگا۔ مجھے لگا کہ یہ دوسروں کو خوراک بنا کر زندہ رہنے والے انسان ہیں۔ لیکن قسمت کو یہ منظور نہیں تھا۔ قسمت میں تو لکھا تھا کہ میری اور ان کی ہمیشہ مٹھ بھیڑ ہوتی رہے گی۔ گرمیوں میں ایک بین الاقوامی اجلاس میں جانے کے لئے ہم دونوں کو مدعو کیا گیا۔ اجلاس کئی مہینے چلنے والا تھا۔ اس لئے ایک دوسرے سے اکثر ملنا ہو جاتا تھا۔

مسٹر کنجوس مجھ سے زیادہ فیاض تھے۔ انہوں نے اپنے خرچ پر بیوی بچوں کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈیلیگیشن کو منا لیا کہ ان کی بیوی کو سیکرٹری کی صورت میں لے جایا جائے۔ تیز طرار تو وہ تھی ہی۔ اپنے 15 سال کے لڑکے کو 12 سال کا بتا کر آدھی ٹکٹ پر لے گئے۔ مجھے یہ سب کیوں نہیں سوجھا؟ میں تو اپنی بیوی کا یوروپ تک کرایہ بھی نہیں خرچ سکا۔

کنجوس اور میں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ انہوں نے سنگل بیڈ روم لیا تھا۔ بیوی ان کے ساتھ تھی۔ سیاست دانوں کو سستے داموں پر ملنے والی ایک گاڑی بھی انہوں نے لے لی۔ ہوٹل کے سامنے سڑک پر لگا دیتے۔ بچے دن ہوٹل میں گزارتے رات کو کار میں سونے چلے جاتے۔ صبح جلدی اٹھ کر آتے اور پاپا کے باتھ روم میں نہا دھو کر تیار ہو جاتے۔ تب مسٹر کنجوس! اپنے ناشتے کا آرڈر دیتے۔ ساری کی ساری مینو منگوا لی جاتی۔ فروٹ جوس، انڈے، بیکن، ساسز، فش، فروٹس، کافی--- کچھ بھی باقی نہ رہے۔ اس طرح ایک آدمی کے نام کا ناشتہ سارا کنبہ مل جل کر کھا لیتا۔

دن میں مسٹر کنجوس میٹنگ میں رہتے۔ بیوی ڈیلیگیشن کی خط و کتابت سنبھالتی۔ دونوں بچے بے ٹکٹ کی آرٹ گیلریوں اور عجائب گھروں کے چکر لگاتے رہتے۔ دونوں بچوں میں بڑی تھی لڑکی۔ عمر تھی اٹھارہ سال۔ ہفتے میں اک بار وہ میرے پاس آتی۔

آنے سے پہلے فون کر لیتی کہ مجھ سے کچھ مشورہ چاہئے تھا' اس لئے ملنا چاہتی تھی۔ میں ہاں کر دیتا۔ وہ پاکٹ بک اور پنسل پکڑے آ دھمکتی۔ مجھے اپنے اوپر فخر ہونے لگتا۔ میری عقلمندی کا فائدہ اٹھا کر چلنے پر جب وہ جانے کو اٹھتی تو میں اس کو لنچ کی تجویز دیتا' جسے وہ فوراً" قبول کر لیتی۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ہفتے میں ایک بار ڈیلیگیشن کے دوسرے افراد کو بھی اسے اپنا مشورہ دینے کا موقع ملتا تھا۔ مس کنجوس انہیں توجہ سے سننے میں لگے اپنے وقت کے زیاں کا ازالہ ان کے ساتھ لنچ کھا کر ہی کیا کرتی تھی۔

شام کو سارا کنجوس کنبہ ایک ساتھ ہی دکھائی دیتا۔ کانگرس بلڈنگ میں ڈیلیگیشن کے لئے کتنے ہی استقبالیہ کمرے تھے۔ اکثر ڈیلیگیشن کے لیڈر وغیرہ یہاں دعوتیں دیتے تھے۔ مدعو بھی ویسے ہی لیڈروں وغیرہ کو کیا جاتا تھا۔ میرے یا کنجوس جیسے لوگوں کو وہاں کون پوچھتا تھا۔ لیکن کنجوس اس طبقاتی امتیاز سے بھلا کہاں گھبرانے والے تھے۔ وہ کسی کسی رسیپشن میں کسی نہ کسی طریقے سے پہنچ ہی جاتے تھے۔

طریقہ ایک ہی ہوتا۔ کنجوس صاحب کا ریڈور میں ایسے بھٹکتے' جیسے ان کا کچھ کھو گیا ہو اور وہ اسے ڈھونڈ رہے ہوں۔ دروازے پر کھڑے میزبان سے انجان بن کر پوچھتے' "آپ نے میری وائف کو تو نہیں دیکھا؟"

میزبان کہتے' "نہیں' انہیں تو نہیں دیکھا' لیکن آپ آیئے نا! ایک ڈرنک تو لیجئے۔"

تھوڑا انکار کرنے کے بعد کنجوس جی ڈرنک کے لئے راضی ہو جاتے اور مہمانوں کی بھیڑ میں گھل مل جاتے۔ تھوڑی دیر بعد مسز کنجوس بھی ویسے ہی کچھ ڈھونڈتی ہوئی وہاں پہنچتیں' میزبان سے پوچھتیں "آپ نے میرے ہسبنڈ کو دیکھا ہے کیا؟"

"ہاں' ہاں' دیکھا کیوں نہیں؟ یہاں کہیں ہوں گے۔ دیکھئے اور ایک ڈرنک بھی لیجئے نا' پھر ان کو لے کر جایئے گا۔"

تو وہ بھی بھیڑ میں ویسے ہی کھو جاتیں۔ کچھ دیر کے بعد دونوں کے بچے اپنے ماں باپ کو ڈھونڈتے ہوئے آتے۔ ہو گیا کہ نہیں سارا کنبہ اکٹھا۔ بس پھر چاروں ٹوٹ پڑتے "سموکڈ سلیمن سینڈوچز" اور "میٹ پیٹیز" پر۔ بعد میں معلوم ہوتا' کہ ایسی شاموں کو مسز کنجوس بچوں کے کانوں میں کسی قدیم بھارتی زبان میں کوئی منتر پھونکتی

تھیں۔ یہ بھی طے کیا تھا کہ اس منتر کے پھونکنے کے بعد ہی دونوں بچے میزوں پر پڑے طرح طرح کے ذائقے دار سامان کی طرف بڑھتے تھے۔ کافی کان دینے کے بعد ڈیلیگیشن کے ممبروں کو معلوم ہوا تھا کہ یہ منتر پنجابی کا فقرہ تھا۔۔۔ "پتر' جو چھکنا اے چھکو' ریسٹورنٹ نئیں جانا پوے گا۔"

کوئی حیرانگی کی بات نہیں تھی کہ انہیں سب لوگ جان گئے تھے۔ ایک تو اس لئے کہ وہ فوراً" ہی لوگوں کی دعوتیں قبول کر لیتے۔ دوسرے اس لئے کہ ان.کی اٹھارہ سال کی لڑکی مس بھوکی کنجوس غضب کی خوبصورت تھی۔ بدیشی اس کے سامنے پتنگوں کی طرح گرتے۔ اس کی ہمت کی چھوت ہندوستانیوں کو بھی لگی۔ ابھی تک تو ہندوستانی واقف کار یہی سمجھتے تھے کہ بچی ہے' پیاری سی۔ ایک دن بیاہی جائے گی' کسی آئی. اے. ایس' یا آئی. ایف. ایس افسر کے ساتھ' یا پھر کسی ٹی اسٹیٹ والے کے ساتھ۔ لیکن یہ جو لمفٹ بدیشی ایک کے بعد ایک اس کا ہاتھ چومتے رہتے تھے' اس سے تو کسی دیش بھگت ہندوستانی کو اسے بچانا ہی پڑے گا' اپنی شریمتی بنا کر۔ خوشی کی بات ہے کہ ایسے مواقع پر ہندوستانی کبھی پیچھے نہیں رہتے۔ ایک جوان آئی. ایف. ایس افسر' جس کے اوپر کتنی ہی ہندوستانی مائیں اپنی بیٹیوں کے لئے نظریں گاڑے بیٹھی تھیں' مس بھوکی کنجوس پر لٹو ہو گیا۔ اب اس کا ارادہ کیا تھا' خدا جانے' لیکن ممی کنجوس نے ایسی چال چلی کہ اس کا ارادہ نیک کر کے ہی چھوڑا۔ بدھو سین' جی ہاں یہی نام تھا اس بھلے مانس کا۔ ہاں تو بدھو سین جال سے نکلنے کے لئے تھوڑا پھڑ پھڑایا بھی' لیکن کنجوس کنبے کی سازشوں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ بدھو سین نے ایسے دکھایا کہ وہ شادی کے لئے تو تیار تھا' لیکن شادی ہندوستان میں ہی جا کر کرے گا' جب چھٹیوں میں وطن لوٹتا ہو گا۔ ممی کنجوس اس قابل کنوارے بدھو سین کو یوروپ میں اکیلا چھوڑنے کے نتائج سے واقف تھیں۔ پھر بدیش میں متعین آئی. ایف. ایس افسر ہندوستان میں لگے دو دو آئی. اے. ایس افسروں کے برابر بیٹھتا تھا۔ اس نے موقع کو ہاتھ سے نہ جانے کی بھرپور کوشش کی۔ اعلان کر دیا کہ بدھو اور بھوکی کی جنم پتریوں کے مطابق شادی سات سمندر پار ہی ہونا لازمی ہے۔

حیرانی ہوئی کہ ہندو بیاہ بدیش کی غیر ہندو آب و ہوا میں کس قدر ممکن ہو سکتا ہے؟ جہیز کے لئے اور شادی کی دعوت وغیرہ کے لئے بدیشی پیسے کا انتظام کیسے ہو گا؟ ہم

لوگوں کو کنجوسوں پر ترس آنے لگا۔ ہم نے سوچا کہ آپس میں چندہ جمع کر کے ہی کنجوس کنبے کی مدد کر دیں۔ لیکن اس کی کوئی ضرورت نہیں پڑی۔

ممی کنجوس نے پھر اپنے پنڈت سے مشورہ کیا۔ ''بون'' میں کیسے اسے پنڈت ملا' یہ بھی اسرار ہی تھا۔ پنڈت نے اعلان کیا کہ آئندہ سکھ کو مد نظر رکھتے ہوئے بھوکی اور بدھو کا بیاہ 15 اگست کو تین بجے ایک مقررہ جگہ پر ہی ہونا چاہئے۔ نقشے کی اچھی طرح جانچ پڑتال کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ جگہ بھارتی سفارت خانے کی عمارت تھی۔ ممی کنجوس سفارت خانے گئیں اور اپنے دکھ درد کا قصہ اس نے سفیر اور ان کی بیوی کو کہہ سنایا۔ ٹسوے بہائے اس کا حل بھی خود ہی بتا دیا۔ اگر آدھے گھنٹے کے لئے بھی اسے سفارت خانے کا استقبالیہ کمرہ مل جائے تو وہ اپنے مہمانوں کو چار بجے سے پہلے رخصت کر دیں گے۔ پانچ چھ مہمان ہی تو ہوں گے۔ ایک دیش بھکت ہندوستانی کی حیثیت سے وہ سمجھتی تھیں کہ اس دن 15 اگست ہے اور استقبالیہ کمرے کو جلدی خالی کر دینا ہو گا۔

سفیر اور ان کی بیوی ممی کنجوس کی دکھ بھری کہانی سے متاثر ہو گئے تھے۔ ویسے بھی بدھو سین ان کے ہی سٹاف کا فرد تھا اور پھر ہندو بیاہتا جوڑا تو یوم آزادی کی تقریب میں اور بھی چار چاند لگا دے گا۔ انہوں نے فوراً" منظوری دے دی۔ اور جیسا کہ ممی کنجوس کا اندازہ تھا' انہوں نے کہا کہ شادی کے مہمانوں کو جلدی رخصت کرنے کی ضرورت نہیں ہے' وہ سب یوم آزادی کی ''ریسپشن'' تک رکے رہ سکتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کو بھی مدعو کر لیا جائے تو بھی فکر نہیں۔

بابا کنجوس نے شادی کے دعوت نامے چھپوانے پر خاصہ خرچ کیا۔ بڑھیا۔ آیوری کارڈ پر سنسکرت الفاظ سمیت چھپوائے تھے۔ کن کن اہم لوگوں کو شادی کارڈ دینے تھے' یہ ذمہ بھوکی نے خود لیا۔ اس لئے مدعو کیا گیا ڈیلیگیشنوں کے صدور اور ریاستی اور مرکزی وزیروں کو جو کہ لوک سبھا اور ودھان سبھاؤں کے چھٹیوں کے دنوں میں یوروپ چھٹیاں گزارنے کے عادی تھے۔ ممی کنجوس نے بڑی نزاکت سے لوگوں کو سمجھایا کہ ہندو رواج کے مطابق دلہن کو اپنی بیٹی ہی سمجھا جاتا ہے اور بیٹی کو رخصت کرتے وقت کوئی نہ کوئی تحفہ تو دینا ہی ہو گا۔۔۔ اب آپ چاہے جو بھی دیں' چاہے دو پیسے کی چیز ہی سہی۔ لیکن خالی ہاتھ آنا تو بدشگونی ہوتی ہے۔

چنانچہ خوش قسمتی سے بھوکی کنجوس اور بدھو سین کی شادی روایتی انداز سے اختتام پذیر ہو گئی مدعو کئے گئے مہمان، جن کی تعداد 100 سے کیا ہی کم ہو گی، ٹھیک تین بجے پہنچے اور یوم آزادی کی تقریب کے "ریسپشن" تک رکے رہے۔ اتنے تحائف آئے کہ ماسٹر کنجوس کو دھونس دے کر ان کی نگرانی کے لئے روکنا پڑا۔

بہت بڑھیا پارٹی ہوئی۔ بدیشی مہمانوں کے جانے کے بعد سفیر صاحب نے نوبیاہتا جوڑے کے سواگت میں "شیمپئن" کی بوتل کھولی۔ دیوالی کی آتشبازی کی طرح کارک کھلے اور جھاگ دار شراب گنگا جل کی طرح بہی۔ اچھی طرح پینے کے بعد کنجوس میاں بیوی اپنے اصلی روپ میں اتر آئے۔ پاپا کنجوس نے اپنی گیلیسوں میں انگلیاں پھنسا کر کہنا شروع کیا--- "اپنے بچوں کے بارے اپنا فرض نبھا کر کتنی خوشی ہوتی ہے! ارے بھلا کس لئے جیتا ہے انسان۔ ارے بھئی" میں پوچھتا ہوں، کہاں لے کر جانا ہے یہ روپیہ پیسہ؟ خرچ کرو۔ ارے، جب تک زندہ ہو، جم کر خرچ کرو۔ وہی تو کہتا ہوں کہ ارجن نے ایک بار کرشن مہاراج سے پوچھا، "دنیا کا سب سے بڑا کرشمہ کیا تھا؟" اور کرشن جی نے جواب دیا---"
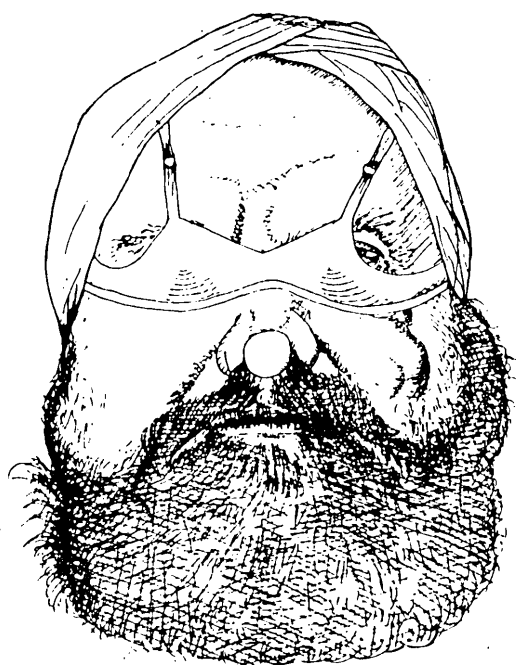
# لندن میں ایک عشقیہ موقع

"برائے مہربانی توجہ دیں۔ ہم لوگ تقریباً" 15 منٹوں میں لندن ہوائی اڈے پر اترنے والے ہیں۔ برائے مہربانی سگریٹ نوشی مت کریں اور اپنی اپنی پیٹیاں باندھ لیں۔"

دروازے کے اوپر چمکتا فلک شاید زیادہ روشن تھا۔ سرخ رنگ کی بتیوں میں صاف جھلک رہا تھا' "سیٹ بیلٹ باندھیے' سگریٹ نوشی مت کریں۔"

کامنی نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ ہوائی جہاز اب بھی روئی کے سفید گالوں کی طرح نیچے پھیلے بادلوں کے اوپر اڑ رہا تھا۔ اسے اب بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ پندرہ منٹوں میں وہ انگلینڈ پہنچنے والی تھی۔ اس نے انگلینڈ کے بارے کافی کچھ پڑھ رکھا تھا۔ اپنے دوستوں اور واقف کاروں سے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا۔ کافی کچھ تصویروں میں بھی دیکھا ہوا تھا' لیکن پھر بھی اس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ کبھی وہ یہاں رہنے بھی آئے گی۔ شاید کرشماتی دور ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ تعلیمی وظیفے کے لئے مہینے بھر کی جان لیوا پاسپورٹ' ویزہ' بدیشی کرنسی' ٹیکس کلیرنس' ہیلتھ سرٹیفکیٹ وغیرہ کی رکاوٹوں کو پار کر کے وہ تو واقعی لندن کی اڑان بھر رہی تھی۔

"آپ کی سیٹ بیلٹ' میڈم!" ایئر ہوسٹس نے اسے یاد دلایا۔

"اوہ' ہاں' سوری" بڑ بڑاتے ہوئے کامنی نے اپنی کمر میں پیٹی کس لی۔

وہ سوچ رہی تھی کہ معلوم نہیں لندن میں اس کا دل بھی لگے گا کہ نہیں۔ اس نے اس کے بارے جو کچھ سنا تھا' یا پڑھا تھا' اس سے تو صاف ظاہر تھا کہ یہ ایک بہت

ہی خوبصورت ملک ہے۔ لیکن یہاں کے باشندوں کو لے کر وہ کچھ پرامید نہیں تھی۔ اس کے گھر کے لوگوں کو انگریزوں نے بہت تکلیفیں دی تھی۔ عدم تعاون کے دوران اس کے باپ اور بھائیوں کو کئی بار جیل جانا پڑا تھا۔ وہ خود بھی یونیورسٹی کے اپنے ابتدائی سال میں سات دنوں کے لئے جیل میں رہ چکی تھی۔ وہیں پر وہ پہلی بار کسی انگریز سے ملی تھی--- ضلع مجسٹریٹ رابرٹ سمتھ سے۔

یہ ایک بہت غیر معمولی ملاقات تھی۔ 1942 کی "بھارت چھوڑو" تحریک کے دن تھے۔ کالج کی لڑکیوں کے ایک جتھے کے ساتھ وہ بھی گلی گلی گھوم گھوم کر دیش بھکتی کے گیت گانے گئی تھی۔ لڑکیاں راستے میں کسی انگریز کو دیکھتیں، تو "بھارت چھوڑو" کے نعرے لگانے لگتیں۔ ان لوگوں کو پولیس نے پکڑ لیا اور ان پر مقدمہ چلانے کے لئے گرفتار کر لیا۔ اس کو چھوڑ کر تمام لڑکیوں نے اپنا جرم قبول کر لیا تھا۔ لڑکیوں کو آئندہ کے لئے وارننگ دے کر رہا کر دیا گیا، لیکن کامنی کو پولیس نے حراست میں لے لیا اور کچھ دیر کے بعد ضلع مجسٹریٹ رابرٹ سمتھ کے سامنے پیشی کے لئے لے جایا گیا۔

کامنی کو وہ منظر اب بھی ہو بہو یاد تھا۔ مون سون ان دونوں اپنی تیزی پر تھا۔ عدالت سے پسینے، کاغذ اور سیاہی کی سیلن بھری ملی جلی بو اٹھ رہی تھی۔ وہاں تقریباً اندھیرا تھا، سوائے دو لیمپوں سے پڑتی روشنی کے۔ ایک تو مجسٹریٹ کی میز پر جل رہا تھا اور دوسرا اس کی بغل میں بیٹھے زرد کاغذوں کی فائل پر جھکے کلرک کے سامنے۔ مجسٹریٹ بھورے بالوں والا ایک نوجوان انگریز تھا۔ اس نے آدھے بازوؤں کی قمیض پہن رکھی تھی اور ڈھیلی کی ہوئی ٹائی اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ فیصلے کے لئے کھڑے لوگوں سے لاتعلق وہ ایک کتاب پڑھنے میں مشغول تھا۔

کلرک نے کامنی اور اس کے والد کا نام پڑھا اور اس کے جرم کے بارے بتایا۔

"قصوروار قبول کرتی ہو کہ بے قصور؟" کلرک نے ہندی میں پوچھا۔

"بے قصور!" لڑکی نے جواب دیا۔

"پوچھو، اس کی عمر کیا ہے؟" مجسٹریٹ نے بغیر ادھر دیکھے ہی آہستہ سے کہا۔

"سیون ٹین" کامنی نے سیدھے انگریزی میں ہی کہا۔

"اس سے کہو کہ اپنے سکول میں واپس لوٹ جائے اور پڑھنے میں دل لگائے۔"

"اس سے کہو کہ یہ انگلینڈ لوٹ جائیں اور اپنے دیش کا بندوبست سنبھالیں"

مجسٹریٹ نے جھٹکے کے ساتھ اوپر دیکھا۔ اس کی آنکھیں کندھوں پر جھولتے بالوں سے گھرے اس خوبصورت چہرے پر پڑیں اور پھر آہستہ آہستہ اس کی لمبی گردن اور دلکش مضبوط بدن سے پھسلتی ہوئیں دوبارہ اس کی چمکتی ہوئی نافرمان' نڈر نظروں سے جا ٹکرائیں۔

''انکریڈبل (ناقابل یقین)۔'' وہ بڑ بڑایا' ''عجب اتفاق ہے۔'' اس نے لڑکی پر سے نظریں ہٹائے بغیر ہی کلرک سے پوچھا' ''کیا نام بتایا؟''

''کامنی' کامنی گاروے!''

''مس گاروے' سکول میں آپ کو پوئٹری (نظم) پڑھائی جاتی ہے؟''

''یس۔۔۔ نو۔'' کامنی ذرا سی ہکلائی۔ لیکن اس معاملے میں اس کا کیا تعلق؟ اس نے بے باکی سے پوچھا' ''آپ کو کیا عدالت میں بیٹھ کر فکشن کی کتابیں پڑھنے کے لئے تنخواہ ملتی ہے؟''

''ناٹ فکشن ینگ لیڈی' پوئٹری (کہانیاں نہیں' نظمیں)۔ میں تمہیں جیل میں پڑھنے کے لئے یہ کتاب بھیجوں گا۔ اچھا تو تم کو دیتا ''اے'' کلاس'' میں سات دنوں کی جیل سمجھیں' اور اگر زیادہ بے باکی دکھائی تو ''کنٹیمپٹ آف کورٹ'' کے تحت سات دن اور۔ اوکے۔۔۔''

دوسرے دن کامنی کو ہیلئر بلاک کی ایک خوبصورت کتاب تحفہ میں ملی۔ اوپر لکھا تھا' ''تحفہ اس شخص کی طرف سے جس نے تمہیں جیل بھیجا۔'' ایک صفحے کو کاغذ کے ایک ٹکڑے کے ساتھ نشان کیا ہوا تھا۔ صفحے پر دو سطریں سرخ رنگ سے انڈر لائن کی ہوئی تھیں۔ سطروں کے کنارے پر لکھا تھا' ''کا۔ گا۔'' سطریں اس طرح تھیں:۔

''سمراٹ کے کمان پر کھنچی تلواریں'
ویسا ہی سندر اس کا مکھ۔''

کامنی نے فیصلہ کیا کہ باہر نکلنے پر وہ اخبار والوں کو عدالت میں کئے گئے مجسٹریٹ کے چال چلن کے بارے بتا دے گی اور تب ضرور ہی اسے نوکری سے نکال دیا جائے گا۔ لیکن سات دن گزرتے نہ گزرتے اسے اپنے فیصلے پر شبہ ہونے لگا۔ گھر لوٹنے پر اسے معلوم ہوا کہ سمتھ نوکری سے استعفیٰ دے کر اپنے دیش انگلینڈ کو واپس لوٹ گیا تھا۔

جہاز نے کئی جھٹکے لئے اور کامنی کے دن کے خوابوں کی کڑیاں ٹوٹ گئیں۔ ہوائی جہاز بادلوں کی پرتوں سے اتر کر سرخ چھتوں والی عمارتوں کے جھرمٹ اور موٹروں سے بھری آڑھی ترچھی سڑکوں کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ چند منٹوں میں وہ رن وے پر اتر آیا اور کسٹم شیڈ کی طرف بڑھنے لگا۔

انگلینڈ میں اپنا پہلا نظارہ لیتی کامنی دیر تک کھڑکی میں بیٹھی رہی۔ سردی کی سہاونی دوپہر تھی۔ اس کے ہوٹل کے سامنے والے پارک میں زرد دھوپ میں بے شمار لوگ ٹہل رہے تھے۔ ایسی سبز گھاس اس نے اپنی زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ پارک کے کنارے کنارے گلیڈیولی کے پھولوں کی طرح طرح کی اقسام لگی تھیں۔ داخلی دروازے پر ایک بوڑھا بھکاری اپنی اورگن پر کوئی بھولی بسری دھن بجا رہا تھا۔ سب کچھ بڑا پرسکون اور دوستانہ سا لگ رہا تھا۔ کامنی نے کمرے سے باہر نکلنے کی سوچی۔

اسے ڈر تھا کہ اس کی ساڑھی کے باعث کہیں لوگ اسے گھورنا نہ شروع کر دیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ وہ بچوں کو تالاب میں ناویں چھوڑتے، عورتوں کو بطخیں چگاتے اور لڑکوں کو تماشائیوں کے گھیرے کے درمیان شور مچاتے ہوائی جہاز (کھلونے) چلاتے دیکھتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ عورت مردوں کے جوڑے لوگوں کی نگاہوں سے بے خبر گھاس پر لیٹے پڑے تھے۔

جب وہ اپنے ہوٹل کی طرف مڑنے کو ہوئی، تو اس نے اپنے آپ کو ایک عجیب سے اکیلے پن میں گھرے پایا۔ اسے خیال آیا کہ شاید یہ اس کی زندگی کی پہلی دوپہر تھی، جب کسی نے بھی اس کے ساتھ بات نہیں کی تھی۔ سب کا کوئی نہ کوئی ساتھی بات چیت کرنے کے لئے تھا، سوائے اس کے۔ اپنے آپ سے پوچھا کہ بھلا اس انجان روکھی جگہ پر وہ آئی ہی کیوں تھی؟

آگے آنے والے دنوں میں بھی کامنی کو اپنے سوال کا جواب نہ مل سکا۔ اب اس کے معمولات میں سما گئے تھے، بھاگم بھاگ سٹیشن کے لئے بس پکڑنا، لیکچر آڈٹ کرنا، کیفے ٹیریا میں دوپہر کا کھانا کھانا، پھر کچھ اور لیکچر اور ایک بار پھر بس کا سفر کرنے کے بعد ریل گاڑی میں پٹے سے جھولتے ہوئے گھر کی طرف لوٹنا۔ گھر! ہاں، اگر اس ہوٹل کو

گھر کہا جا سکے' جہاں کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ صرف پٹے پٹائے اظہار احترام کے سوا' جہاں بات چیت بھی ہوتی ہو تو پھسپھساہٹوں میں اور بات چیت میں چھائی خاموشی ٹوٹتی ہو' صرف اخباروں کی چرمراہٹوں میں۔

جب سے وہ بھارت سے یہاں آئی تھی' دل میں ایک دبی دبی سی امید بنی ہی رہتی تھی کہ کہیں نہ کہیں تو رابرٹ سمتھ سے وہ ٹکرا ہی جائے گی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا سوچنا بیوقوفی تھی۔ ہو سکتا تھا وہ انگلینڈ میں رہتا ہی نہ ہو' کہیں افریکہ یا امریکہ میں جاکر بس گیا ہو۔ اور اگر انگلینڈ میں بھی تھا تو بھی لندن کی 80 لاکھ کی آبادی میں اتفاق سے اس کو ملنے کا امکان بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ اور اگر وہ کبھی مل بھی گیا' تو بھی کیا وہ اسے پہچان پائے گا؟ وہ اس سے کہے گی کیا؟ اور وہ کیا کہے گا؟ اس نے ٹیلی فون ڈائریکٹری میں رابرٹ سمتھ کا نمبر ڈھونڈنا چاہا۔ لیکن سمتھ ناموں سے تو ڈائریکٹری کے صفحے کے صفحے بھرے پڑے تھے۔ پہلے نام کے حروف "ر" سے بھی ہزاروں نام تھے۔ اور اگر فون کرے گی بھی تو بہانہ کیا بنائے گی' فون کرنے کا؟

پھر بھی رابرٹ سمتھ کو ایک بار دیکھ پانے کا خیال دل میں بنا ہی رہا۔ یہاں تک کہ یہ خیال بڑھ کر جنون بن گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر وہ واقعی چاہے گی تو کسی نہ کسی طرح اسے ڈھونڈ ہی نکالے گی۔ کتابوں میں اس نے پڑھ رکھا تھا' کہ ہم آہنگ دلچسپیوں والے لوگ ایک جیسی چیزوں کے بارے کشش رکھتے ہیں اور کبھی نہ کبھی آپس میں ٹکرا ہی جاتے ہیں۔ اس نے دل ہی دل میں پورا خاکہ کھینچ لیا تھا کہ وہ کیسے ملیں گے۔ وہ اپنا ہیٹ اونچا کرکے کہے گا' "مس گاروے' آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں؟" اور وہ کہے گی' "اگر میں غلطی نہیں کر رہی تو آپ' مسٹر سمتھ ہیں۔ یس آف کورس' ہم لوگ پہلے مل چکے ہیں۔ اگرچہ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ وہ ایک خوشگوار ملاقات تھی۔ ہاؤ ڈو یو ڈو؟ آپ کیسے ہیں' مسٹر سمتھ؟"

پولی ٹیکنیک کا سیشن ختم ہونے والا تھا۔ نہ تو کامنی کی قوت ارادی اور نہ ہی کوئی اتفاق اسے رابرٹ سمتھ سے ملا سکا۔ ایک دن ہمیشہ کی طرح اس نے ٹیوب سٹیشن کے لئے بس پکڑی۔ زمین دوز راستے کے دوسرے کنارے پر جب وہ اگلی بس پکڑنے کے لئے باہر نکلی تو اس نے دیکھا کہ سڑکوں سے گاڑیاں ہٹا لی گئیں تھیں اور فٹ پاتھ لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ دور سے ہی اس نے مشک بینوں کی ریں ریں

اور بڑے بڑے ڈرموں کو پیٹنے کی آوازیں سنیں۔ اپنے ہاتھ میں تھامے پرچے پر اس نے نگاہ ڈالی اور پایا کہ کسی مہمان بادشاہ کے ساتھ انگلینڈ کے شہنشاہ کی سواری وہاں سے گزرنے والی تھی۔ تبھی اس نے فیصلہ کر لیا' کہ آج وہ اپنا لیکچر "مس" کر دے گی اور بھیڑ کے ساتھ مل کر فوجیوں کا مارچ دیکھے گی۔

"سکاٹش ہائی لینڈر فوجیوں" کا ایک دستہ مارچ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ آگے آگے ان کا لیڈر اپنی چوب کو اوپر اٹھاتا ہوا چل رہا تھا۔ ان کے پیچھے شاہانہ رفتار سے آہستہ آہستہ مارچ کرتے ہوئے گارڈ چلے آ رہے تھے۔ ان کے بہت بڑے فوجی ٹوپ' پیتل کے چمکیلے بٹنوں والے کوٹ اور سنگینوں سے سجی رائفلیں۔ سب مل کر ایسی چکا چوند پیدا کر رہے تھے کہ لگتا تھا جیسے بھالوں کا جنگل اگ آیا ہو۔ کامنی کے سینے میں خوشی سی اٹھی۔

گارڈ سڑک کے دونوں طرف قطاریں باندھتے ہوئے اس کے بالکل سامنے آکر رک گئے۔ کچھ دیر کے بعد گھوڑ سواروں کا دستہ آیا اور اس کے بعد بارہ سیاہ گھوڑوں سے جتا شہنشاہ کا سنہری رتھ وہاں سے گزرا۔ گارڈ محتاط حالت میں آئے اور ترچھے ہو گئے۔ شہنشاہ اور ان کے شاہی مہمان بینڈ کے سر میں سر ملا کر مسرت کے گیت گاتی ہوئی بھیڑ کو ہاتھ ہلاتے ہوئے وہاں سے گزر گئے۔

جیسے ہی جلوس گزرا' بھیڑ تتر بتر ہونا شروع ہو گئی۔ کامنی دم بخود سی وہاں کی وہاں جمی کھڑی رہی۔ دفتروں کی طرف دوڑتے لوگ اس سے ٹکرا ٹکرا کر جانے لگے۔ صرف اس کے سامنے کھڑی لڑکی اب بھی وہیں کھڑی تھی۔ کامنی نے اس کے سسکنے کی آواز سنی تھی' اور جب اس نے مڑ کر دیکھا تو پایا کہ وہ اپنی ہتھیلی کے پچھلے حصے سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی اور بیگ میں سے رومال تلاش کر رہی تھی۔ کامنی کو اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ جھجک سی گئی اور بولی' "فوجیوں اور جلوسوں کو دیکھتی ہوں تو معلوم نہیں' مجھے کیا ہو جاتا ہے؟ انہیں دیکھ کر ہمیشہ آنسو بہہ نکلتے ہیں---"

"اٹ از ویری موونگ۔ پھر بھی بہت دلکش منظر تھا۔ اتنے سارے فوجیوں کو ایک ساتھ دیکھنا کتنا اچھا لگتا ہے نا؟"

"بڑا عجیب لگ رہا ہے' آپ کے منہ سے یہ سننا۔ میرا بوائے فرینڈ بھی یہی کہا کرتا تھا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ ایک خوبصورت عورت اپنی تلواریں کھینچے فوجیوں کے دستے جیسی لگتی ہے۔ بلکہ سچ کہوں تو وہ میرے لئے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ وہ ہندوستان میں بھی کچھ

عرصے تک رہا اور ہندوستان اسے پسند بھی آیا تھا۔" انگریز لڑکی نے رندھی آواز میں کہا۔

"آپ کا بوائے فرینڈ اب کہاں ہے؟" کامنی نے پوچھ تو لیا' لیکن اسے لگا کہ ایک اجنبی سے' اس طرح کا ذاتی سوال پوچھنے کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔

لڑکی نے آنسوؤں سے بھرا پنا چہرہ اس کی طرف پھیرا اور کہا' "وہ تو دوسری جنگ عظیم میں مارا گیا۔"

# ماؤڈلے کی میم صاحب

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر ڈائسن اپنے گھوڑے سے اترا اور منظر کا نظارہ کرنے لگا۔ جنگل کے بیچوں بیچ صاف کئے گئے ایک قطعے میں سرخ اینٹوں کا بنا ریسٹ ہاؤس تھا۔ پہاڑ کی ڈھلان پر چاروں طرف اونچے اونچے درختوں کا گھیرا تھا۔ درختوں کے تنوں سے لپٹی بیلوں نے شاخوں پر اپنا مکڑ جال بنا ہوا تھا۔ کہیں کوئی خالی جگہ دکھائی دیتی تھی تو صرف اسے اس طرف ہی، جہاں سے ہو کر ایک سڑک گھاٹی کی طرف جاتی تھی۔ گھنے جنگلوں سے بھاری گھاٹی کی وسعت سینکڑوں میلوں تک تھی۔

سامان تو پہلے ہی آچکا تھا اور برآمدوں میں پڑا تھا۔ نوکروں کے کوارٹروں کے پاس کولھوں کے بل بیٹھے قلی ایک چھوٹے سے مٹی کے حقّے کو باری باری سے گڑگڑا رہے تھے۔ قریب ہی سٹیل کی کرسی پر بیٹھا اور سیئر ان سے باتیں کر رہا تھا۔ ڈائسن کے پہنچتے ہی حقہ گڑگڑاتے قلی اٹھ کھڑے ہوئے اور سیئر ان سے ملنے کو آگے بڑھا۔

"بڑا پیارا باغیچہ ہے۔" ڈائسن نے اور سیئر سے کہا، "اس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟"

"ایک بوڑھا مالی ہے صاحب! جب سے یہ گھر بنا ہے، تقریباً پچاس سال ہوئے ہوں گے، وہ مالی یہیں رہتا ہے۔ ایک دبلا پتلا بوڑھا آدمی قلیوں کے گھیرے سے نکل کر ڈائسن کی طرف بڑھا اور ہاتھ جوڑ کر جھک گیا "غریب پرور، میں جب پندرہ سال کا تھا، تب سے یہاں کا مالی ہوں، جین میم صاحب مجھے یہاں لائی تھیں۔ اب میں ساٹھ سال کا ہوں۔ جین میم صاحب یہیں مریں اور حضور، میں بھی یہیں مروں گا۔"

''جین میم صاحب؟ کیا کاٹل صاحب کی بیوی؟'' ڈائسن نے اور سیئر کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔

''نہیں صاحب' اس کے بارے کوئی بھی کچھ خاص نہیں جانتا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ ایک سماجی ورکر تھی' کوئی کہتا ہے کہ ٹیچر تھی۔ کوئی کوئی تو کہتے ہیں کہ وہ مشنری تھی۔ اب کیا جانیں صاحب' اصلیت کیا ہے؟ ہاں' اتنا ضرور ہے کہ یہ بنگلہ اس نے ہی بنوایا تھا اور یہاں بچوں کا سکول لگتا تھا۔ پھر اچانک ہی وہ گزر گئی۔ کسی کو اس کے بارے کوئی بھی پکی جانکاری نہیں۔ بعد میں سرکار نے اس بنگلے پر اپنا قبضہ کر لیا اور اسے فاریسٹ افسروں کا ریسٹ ہاؤس بنا دیا۔''

مسز ڈائسن اور اس کی بیٹی جینیفر کو پالکی میں لے کر آرہے قلیوں کے شور و غل نے بات چیت کا سلسلہ توڑا۔

''یہاں کبھی مشن سکول ہوتا تھا۔'' ڈائسن نے انہیں بتایا' ''جگہ بری نہیں ہے' کیوں؟''

پورے کنبے نے خاموشی سے ماحول کا جائزہ لیا۔ بنگلے کو' اس کے لان کو' پھولوں کی کیاریوں اور بیلوں سے ڈھکے ساگوان کے جنگل کو غروب ہوتا سورج اپنی سنہری روشنی میں رنگ رہا تھا۔ ماحول پر سکون تھا' تھما تھما سا' دور کہیں گھائی میں بہتی ندی کا قلقل شور شام کی خاموشی کو اور بھی راحت بخش کر رہا تھا۔

قلی اور اور سیئر سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گھائی سے اپنے گاؤں کی طرف چل پڑے اور ڈائسن گھرانہ اپنے گھر کو منظم کرنے میں مصروف ہو گیا۔ بیروں نے مٹی کے تیل کی لالٹین جلائیں اور بستروں پر مچھر دانیاں لگا کر کھانے کی میز سجا دی۔ مسز ڈائسن اور اس کی بیٹی جینیفر کمروں کا معائنہ کرنے لگیں۔ ڈائسن برآمدے میں پڑی کین کی ایک بڑی آرام دہ کرسی پر پسر گیا۔ اس نے اپنا پائپ جلایا اور بیرے کو سکاچ لانے کا حکم دیا۔

وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈوبتے سورج نے مون سون کے بادلوں کو پہلے چمکیلے سنہرے رنگ میں ڈھالا' پھر تانبے کے رنگ میں' پھر سنتری' گلابی' سفید اور آخرکار اداسی بھرے بھورے رنگ میں۔ شام کے رات میں تبدیل ہوتے ہی اس گرم ملک کے جنگل پر ایک پراسرار اداسی چھا گئی۔ چڑیاں گھونسلوں کو چلی گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے

اندھیرا پوری طرح گھر گیا۔ اب جنگل ایک دوسری ہی طرح کی الفاظی آوازوں کے ساتھ جاگنے لگا۔ کہیں سے آرہی تھیں مینڈکوں کی ٹرٹر' تو کہیں سے سیاروں اور لگڑ بگوں کی آوازیں! ڈائسن اپنا پائپ پی رہا تھا اور سکاچ کی چسکیاں لے رہا تھا۔ لان میں منڈلاتے جگنو اس کی کرسی کے قریب تک آکر جگمگانے لگے۔

بیرے نے آکر بتایا کہ کھانے کی میز لگ چکی تھی۔ میز پر موم بتیاں جل رہی تھیں۔ مینٹل پیس پر پڑی مٹی کے تیل کی لالٹین وقت اور بارش سے دھندلائی مٹمیلی دیواروں پر اپنی مریل زرد روشنی پھینک رہی تھی۔ .

کسی نے کوئی بات نہیں چھیڑی۔ ماحول کی سانس گھونٹنے والی خاموشی کو توڑ رہی تھیں' صرف پلیٹیں اور ڈونگے لے کر آتے جاتے بیروں کے کپڑوں کی سر سراہٹیں اور کانچ کے برتنوں اور کانٹے چھریوں کی کھنکھناہٹیں۔ جینیفر ذرا بے چین سی لگ رہی تھی۔ وہ گھر کا معائنہ ہی کر رہی تھی' جبکہ بیرا اسے کھانے کے لئے بلانے آگیا۔ اچانک اس نے اپنا چھری اور کانٹا تڑ سے پلیٹ میں رکھ دیا۔۔۔ "ممی دیکھو' دیوار پر یہ کیسی تصویر ہے!"

مسٹر ڈائسن نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چھت سے ٹپکتے بارش کے پانی کی وجہ سے دیوار کا ڈسٹمپر جگہ جگہ لمبی لمبی لکیروں میں بدرنگ ہوا پڑا تھا۔ دیوار پر طرح طرح کی ٹیڑھی میڑھی شکلیں بنی ہوئی تھیں' جو لالٹین کی ٹمٹماہٹ میں الگ الگ صورت اختیار کر رہی تھیں۔

"جینیفر۔" مسز ڈائسن نے بھرائے گلے سے کہا' "مجھے اس طرح ڈرانا بند کرو اور چپ چاپ اپنا کھانا کھاؤ۔"

باقی کے کھانے کے دوران خاموشی چھائی رہی۔ جب کافی آئی تو جینیفر سونے جا چکی تھی۔

مسز ڈائسن نے دیوار کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ دیوار پر کچھ بھی نہیں تھا۔

"جون' مجھے یہ جگہ پسند نہیں آئی!"

ڈائسن نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے پائپ میں تیلی کے ساتھ دبا دبا کر تمباکو ٹھونسا اور اسے سلگایا۔

"تم تھک گئی ہو' ڈیئر' بہتر ہے' ابھی سو جاؤ۔"

مسز ڈائسن سونے چلی گئی۔ ڈائسن بھی کچھ دیر بعد چلا آیا اور لمحے بھر بعد ہی خراٹے مار کر سونے لگا۔ لیکن مسز ڈائسن کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے مچھر دانی کے ڈنڈوں کے سہارے اپنے تکئے ٹکائے اور باغیچے کی طرف دیکھنے لگی۔ رات اندھیری تھی۔ اوپر چاند نظر نہیں آرہا تھا' لیکن آسمان صاف تھا اور لان ستاروں کی مدھم روشنی میں جھلک رہا تھا۔ لان کے پار اونچی سیاہ دیوار جیسا کھڑا گھنا جنگل تھا۔ جنگل مختلف جانوروں اور پرندوں کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ کہیں مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ تو کہیں جھینگروں کی آوازیں' کہیں سے آرہی لکڑ بھگوں کی آوازیں' تو کہیں سے سیاروں کی ہواں' ہواں۔ مسز ڈائسن کے پسینے چھوٹنے لگی۔

کئی گھنٹوں بعد جنگل کے سر پر زرد سا چاند اگا اور اس نے باغیچے پر ایک اداسی بھری چمک چھڑک دی۔

مسز ڈائسن نے اپنے دل کی بزدلی کو بھگانے کے لئے باغیچے میں ٹہلنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ننگے پاؤں چلنے لگی۔ اس کے پاؤں کو ٹھنڈی ٹھنڈی گیلی گھاس کا لمس اچھا لگ رہا تھا۔ چلتے چلتے اس نے دیکھا کہ گھاس پر بچھی اوس کی سفیدی پر جہاں جہاں اس کے پاؤں پڑ رہے تھے' وہاں وہاں پاؤں کے سبز نشان بنتے جا رہے تھے۔ اس نے اپنا سر ایسے جھٹکا' جیسے کوئی بھاری بوجھ سر سے اتار رہی ہو۔ لمبی لمبی سانسیں بھر کر اس نے اپنے آپ کو کافی ہلکا اور ترو تازہ محسوس کیا۔ اب اسے بالکل بھی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔

مسز ڈائسن چاندنی رات میں بھیگے لان پر کافی دیر تک ٹہلتی رہی۔ ترو تازہ محسوس کرتے ہوئے اس نے دوبارہ سونے کا فیصلہ کیا۔ برآمدے میں قدم رکھتے ہی وہ اچانک ٹھٹھک کر رک گیا۔ تھوڑے ہی فاصلے پر اسے لان پر کسی کے قدموں کے نشان دکھائی دیئے۔ اجنبی قدموں کے نشانات سے لان پر ایک پگڈنڈی سی بن گئی تھی' جو لان کے آخری سرے تک پہنچتی ہوئی جنگل میں جاکر غائب ہو جاتی تھی۔ مارگریٹ ڈائسن کو خوف سے حرارت سی محسوس ہونے لگی اور وہ وہیں پر گر پڑی۔

جب اسے ہوش آیا تو صبح ہونے ہی والی تھی۔ سارا ماحول چڑیوں کی چہچہاہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ مسز ڈائسن بے حد تھکی تھکی سی آہستہ آہستہ اپنے بستر کی طرف بڑھی۔ ڈاسن اپنا ناشتہ کرکے باہر جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ لان کے دوسری طرف اور میئر اور قلی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈائسن سورج غروب ہونے سے کچھ پہلے ہی گھر لوٹ آیا۔ اس نے اپنی سکاچ اور سوڈا منگوایا اور بیرے کے سامنے جوتے کے فیتے کھولنے کے لئے اس نے اپنے پاؤں پسار دیئے۔ وہسکی کے کچھ پیگ گلے سے نیچے اتار کر وہ کافی خوش نظر آرہا تھا۔

''ڈنر میں کیا بن رہا ہے؟ خوشبو سے تو لگ رہا ہے کہ چکن کری بنی ہے--- مجھے تو بھوک لگنے لگی ہے۔ واقعی اس کھلی ہوا کا بھی جواب نہیں!''

گھر کی لوگ خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ ڈائسن کو کھانا ذائقہ دار لگ رہا تھا۔ تبھی ایک سیار لان کو پھلانگتا ہوا ڈائنگ روم کے دروازے کے پاس آکھڑا ہوا' اور ''ہواں ہواں'' کرنے لگا۔ مسز ڈائسن کے ہاتھ سے کانٹا چھوٹ گیا۔ ڈائسن کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بڑ بڑائی' ''جون' مجھے یہ جگہ اچھی نہیں لگ رہی---''

''تمہارا جی اچھا نہیں ہے۔ ویسے تو یہ سیار ہی تھا' اس سے کیا ڈرنا؟ ایک آدھ کو تو میں شوٹ کر ہی دوں گا۔ پھر وہ تمہیں پریشان نہیں کریں گے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کل رات نیند تو ٹھیک سے آئی کہ نہیں؟''

''ہاں' ہاں' تھینک یو!''

جینیفر نے جیسے تیر سا چھوڑا' ''لیکن ممی' میں نے تو تمہیں رات لان میں ٹہلتے دیکھا---''

''تم اپنی پڈنگ ختم کرو اور سونے جاؤ۔'' مسز ڈائسن بولی۔

''لیکن ممی' میں نے تمہیں رات کو لان میں سیر کرتے دیکھا تھا۔ تم نے سفید رنگ کا گاؤن پہنا ہوا تھا۔ تم میری مچھردانی کے پاس بھی آئی تھیں' یہ دیکھنے کہ میں سو رہی ہوں' یا نہیں؟ میں نے تمہیں دیکھا تھا' ممی!''

مسز ڈائسن کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔

''بکواس مت کرو' جینیفر--- اور سونے جاؤ! میرے پاس کوئی سفید گاؤن نہیں ہے اور یہ بات تم جانتی بھی ہو۔'' مسز ڈائسن نے جینیفر کو جھڑکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ تبھی ڈائسن بھی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

''رات کو تمہیں کوئی پریشانی ہوئی کیا؟''

''میں بالکل ہی نہیں سو پائی--- لیکن جون' میرے پاس کوئی سفید رنگ کا گاؤن نہیں ہے اور نہ ہی میں نے رات جینیفر کی مچھردانی کے اندر جھانکا تھا۔''

"ارے چھوڑو بھی! یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ کم جون جینیفر' اپنی پڈنگ ختم کرکے سونے چلو۔ میں اپنی بندوق لے کر آتا ہوں اور ان سیاروں میں سے ایک نہ ایک کو نشانہ بناتا ہوں۔ جینیفر' پھر کوٹ بنوانے کے لئے سیار کی کھال کیسی رہے گی؟" ڈائسن نے حوصلے سے پوچھا۔

"نہیں' مجھے سیار اچھے نہیں لگتے۔"

ڈائسن اپنی بندوق لے آیا اور اس میں کارتوس بھر کر اس نے اسے اپنے پلنگ کے پاس دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اس نے اپنا پائپ جلایا اور سونے کے وقت تک باتیں کرتا رہا۔

"اگر سیار کی آواز سنائی دے تو مجھے جگا دینا۔" اس نے اپنی بیوی سے کہا' "ضرور جگا دینا مجھے' ہاں---"

"یس ڈیئر---"

کچھ ہی منٹوں میں ڈائسن گہری نیند میں سو گیا۔ جینیفر بھی سو گئی تھی۔ لیکن مسز ڈائسن کی آنکھوں میں نیند کہاں؟ وہ تو لگاتار اپنی مچھردانی کے باہر لان کو اور جنگل کے درختوں کی گھنی قطار کو ہی دیکھ رہی تھی۔

کہر کے دھندلکے سے اچانک ہی سفید ڈریسنگ گاؤن میں لپٹی نسوانی شکل نمودار ہوئی۔ اس کے بال دو چوٹیوں میں گندھے تھے اور اس کے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ اس کے نین نقش صاف صاف نظر نہیں آ رہے تھے' لیکن اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک تھی۔ مسز ڈائسن خوف سے ٹھنڈی پڑنے لگی۔ اس نے چیخنا چاہا' لیکن صرف ایک کمزور سی بڑبڑاہٹ ہی اس کے گلے سے باہر نکلی۔ جون ڈائسن اب بھی خراٹے مارتا بے خبر سویا ہوا تھا۔

مسز ڈائسن پر آنکھیں مرکوز کئے ہوئے وہ طلسماتی شکل برآمدے کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی وہ شکل لان کے درمیان ہی پہنچی تھی کہ ایک سیار بھاگتا ہوا آیا اور اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ سیار نے اپنا سر اٹھایا اور اس نے زور سے ہوک لگائی۔ فوراً ہی اور سیار بھی اس کے ساتھ آ ملے اور ایک سر ہو کر ہانکنے لگے۔

مسز ڈائسن کی دبی ہوئی کراہیں بے قراری سے چیخوں میں تبدیل ہونے لگیں۔ جون ڈائسن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور اپنی بندوق کی طرف دوڑا۔ اس سے پہلے کہ وہ

حالات کا جائزہ لیتا اور اپنا نشانہ باندھتا سیار مختلف سمتوں میں دوڑتے ہوئے غائب ہو گئے۔

"حرامی، بھاگ گئے سب۔" ڈائسن اپنے آپ میں ہی بڑبڑایا۔

"دوسرے دن ڈائسن کی گھبراہٹ بہت بڑھ گئی معلوم ہوتی تھی، "معاف کرنا ڈیئر، میں نے کل رات تمہیں ڈرا ہی دیا۔" ڈائسن اپنی بیوی سے بولا، لیکن آج میں ان سیاروں کو نہیں چھوڑوں گا۔"

"جون، تم نے کیا سیاروں کے علاوہ کچھ اور نہیں دیکھا؟"

"کچھ اور؟ کیا مطلب؟"

"سفید کپڑوں میں لپٹی عورت! وہ سیدھی ہماری ہی طرف بڑھی آرہی تھی۔ جب تم نے بندوق اٹھائی۔"

"نان سینس، مجھے تو صرف یہی دکھ ہے کہ میں سیاروں پر نشانہ نہیں لگا سکا۔ تم اپنے آپ کو سنبھالو، مارگریٹ!"

"مگر جون، تمہیں میری بات کا یقین کرنا پڑے گا۔ پہلی رات ہی میں نے لان پر اس کے پاؤں کے نشان دیکھے تھے۔"

مسز ڈائسن پھر اٹھ کھڑی ہوئی، "میرے ساتھ آؤ میں دکھاتی ہوں۔"

وہ ڈائسن کو لان تک لے گئی۔ لان پر ابھی بھی سفید کہرا چھایا ہوا تھا جو ہلکی دھوپ میں چمک رہا تھا۔ پاؤں کے نشانات واقعی موجود تھے۔ ان کا معائنہ کرتا ہوا ڈائسن وہاں تک پہنچا، جہاں زمین کا ایک ٹکڑا صاف کیا ہوا تھا۔ اس خالی زمین کے عین درمیان ایک قبر تھی۔ قبر بہت پرانی اور خستہ حالت میں تھی۔ اوپر نہ کوئی پتھر لگا تھا، نہ ہی کوئی کتبہ۔ اس پر گھاس اگی ہوئی تھی اور پلاسٹر کی دراڑوں میں بھی گھاس پھوس اگ آئی تھی۔

ڈائسن گھبرایا ہوا معلوم ہو رہا تھا، لیکن اس نے مطمئن رہنے کی اداکاری کی، "سمجھ میں نہیں آتا کہ ---" وہ کچھ بڑبڑایا۔

جب اور سیئر کام پر آیا تو ڈائسن نے اسے بلا بھیجا اور دروازہ بند کر کے پوچھا، "سندر لال، تمہیں اس گھر کی بابت کیا کچھ معلوم ہے؟"

"سر، کچھ خاص نہیں۔" اور سیئر نے کہا، "قصے تو کئی پھیلے ہوئے ہیں، آس پاس

کے گاؤں میں' سر! اور یہ اندھے اعتقاد والے لوگ ان پر یقین بھی رکھے ہوئے ہیں۔ یہ گھر دراصل کئی سالوں سے خالی پڑا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ اس پر سرکار کا قبضہ ہو جانے کے باوجود کبھی کوئی ہندوستانی افسر یہاں رہنے کو راضی نہیں ہوا۔ لیکن مالی یہاں ہمیشہ سے رہ رہا ہے اور وہ تو یہاں پر کافی خوش ہے۔"

"مالی کو بلاؤ۔"

سندر لال مالی کو لے کر واپس لوٹا--- "صاحب اس گھری بابت کچھ جاننا چاہتے ہیں۔ صاحب کو کچھ بتا دو' جو کچھ بھی تم جانتے ہو۔"

"غریب پرور"" بوڑھے مالی نے ہندوستانی میں بولنا شروع کیا' "یہ گھر جین میم صاب نے بنوایا تھا۔ جین میم صاحب مانڈلے سے آئی رہیں۔ یہاں وہ بچوں کا اسکول چاہتی تھیں۔ زمین تو سرکار کی تھی حضور! تو کئی سالوں کی مقدمے بازی کے بعد سرکار جیت گئی اور یہ زمین پھر سے واپس سرکار کے قبضے میں چلی گئی۔"

"جین میم صاب کو کیا ہوا تھا؟"

"حضور' وہ اسی گھر میں مریں۔ اصل میں سرکار کا قبضہ ہونے کے بعد انہوں نے اسکول بند کر دیا۔ تبھی وہ بیمار پڑ گئیں۔ برسات کے موسم میں بھی باغیچے میں گھومتی ٹہلتی رہتی تھیں' اس لئے ان کو ایک دن ملیریئے نے گھیر لیا۔ دو تین اٹیک کے بعد وہ گزر گئیں۔ ریاض ان کا بیرا تھا' مسلمان! ان کی موت پر صرف ایک میں پاس تھا اور ایک وہ بیرا۔ ہم دونوں نے مانڈلم جاکر صاحب لوگوں سے معلوم کیا۔ لیکن ان کو وہاں کوئی جانتا ہی نہیں تھا۔ ہم دونوں نے ان کو جنگل میں دفنایا۔ ریاض تو چلا گیا۔ مانڈلہ میں بیرے کا کام کرتا ہے۔ میں یہیں سرکار کے لئے کام کرنے لگا۔"

"ان کی موت کے بعد یہاں کون کون رہتا تھا؟"

"یہاں تو کوئی بھی نہیں رہتا' صاب! افسر لوگ آتے ہیں' جاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس جگہ پر پر جین میم صاب کا شراپ (بددعا) ہے۔ لیکن مجھے تو یہاں پچاس سال سے بھی اوپر ہو گئے۔ میرا تو کوئی نقصان نہیں ہوا' حضور!"

ڈائسن نے اور سیئر اور مالی کو واپس بھیج دیا اور اپنی بیوی کے پاس چلا گیا۔

"مالی اور اور سیئر سے میں نے بات کی ہے۔" ڈائسن نے لاپرواہی کے سے لہجے میں اسے بتایا' "سب بکواس ہے کوئی اس گھر میں رہ نہیں سکتا۔ مالی تو یہاں گزشتہ

پچاس سالوں سے رہ رہا ہے۔ خیر' جو بھی ہو' میں تو یہاں رہوں گا اور اس بھوت کو ہمیشہ کے لئے ٹھکانے لگا کر ہی دم لوں گا۔"

اس رات بھی ڈائسن نے اپنی بندوق میں دو گولیاں بھریں اور اس کا سیفٹی کیچ اتار دیا۔ رات کے کھانے کے بعد اس نے کئی کپ بلیک کافی کے پیئے۔ اپنے بستر کے پاس اس نے ایک لالٹین رکھوا لی اور الماری سے "بلیک وڈ میگزین" کی پرانی کاپیاں نکال کر بیٹھ گیا۔ مسز ڈائسن کو آج کچھ تسلی ہوئی کہ بتی جل رہی تھی اور اس کا خاوند جاگ رہا تھا۔ اس لئے اسے جلدی ہی بے دھڑک نیند آ گئی۔

کچھ دیر ڈائسن اپنا پائپ پیتا رہا۔ کچھ دیر تک وہ پڑھتا بھی رہا۔ پھر اس نے لالٹین کی بتی ذرا دھیمی کی اور پائپ پینے لگا۔ یہ رات گزشتہ راتوں سے کہیں زیادہ اندھیری تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور بھیگی بھیگی ہوائیں بارش کے آثار جتلا رہی تھیں۔ آدھی رات کے کچھ دیر بعد ہی بجلی کی گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ ہوا کی تیزی سے بارش کی پھواریں برآمدے سے ہوتی ہوئیں مچھر دانی تک پہنچنے لگیں۔ بجلی کی کڑک کے باوجود مسز ڈائسن اور جینیفر گہری نیند میں سوئی رہیں۔ ٹھنڈی بوچھاڑیں ڈائسن کو بھی بے خواب کر گئیں۔ اپنے تکیئے کے سہارے بیٹھا بیٹھا ہی وہ اونگھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ایک سیار برآمدے کے پاس آیا اور "ہواں' ہواں" کرنے لگا۔ جھٹکے کے ساتھ ڈائسن اٹھ بیٹھا۔ تبھی لالٹین کی بتی پھڑپھڑائی اور بجھ گئی۔ مچھر دانی کے اندر سے ڈائسن نے ایک انسانی شکل کی چھایا اپنے پلنگ کے قریب کھڑی دیکھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک جوڑی' چمکیلی آنکھیں اس کی طرف ٹکٹکی باندھے گھور رہی ہیں۔ اچانک بجلی چمکی اور اس نے اس شکل کو واضح دیکھا--- سفید رنگ کے کپڑوں میں کندھوں پر چوٹیاں لٹکائے ہوئے ایک نسوانی شکل۔ وہ حیران سا اسے ویسے ہی دیکھتا رہا۔ بجلی کے کڑکنے نے اس کی اونگھ توڑی۔ خوف بھری چیخ کے ساتھ وہ اپنے بستر سے کودا اور اپنی بندوق کی طرف لپکا۔ اس کی نظر مسلسل اپنے بستر کے قریب کھڑی شکل پر ٹکی رہی۔ اس نے بندوق کا کندا اپنے ہاتھ میں پکڑا اور بے چینی سے گھوڑے (ٹریگر) کو ٹٹولنے لگا۔ دو بار زور کا دھماکہ ہوا اور ڈائسن زمین پر گر پڑا۔ بندوق کی گولیاں ٹھیک اس کے ماتھے میں لگی تھیں۔

# تتلی

"ملئے، میرے دوست چارلس سے۔" میں نے ڈاکٹر کو اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"نام ہے، رمیش چندر۔۔۔" چارلس نے ڈاکٹر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔"

یہ عام اصول تھا۔ اس کے دوست اس کا تعارف چارلس نام سے کراتے تھے اور وہ ان کو ٹھیک کرتا، "نام ہے، گرمیش چندر۔" لیکن ایسا بھی نہیں تھا، کہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہو۔ دراصل جب میں پہلی بار چارلس سے ملا، مجھے یہ شک بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ رمیش چندر بھی ہو سکتا ہے۔ وہ شملہ کے ایک مشن سکول سے اینگلو انڈین لڑکوں کے بیچ کے ساتھ یونیورسٹی میں آیا تھا۔ ہم لوگ انہیں "ہم لوگ فرق ہیں" کے گروہ کے نام سے پکارتے تھے اور انہیں اس خصوصیت پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ اس گروہ میں تھے سمتھ، سٹینلیز اور جانسن! یہاں تک کہ اس گروپ میں شامل ہندوستانیوں کے نام بھی انگریزی کے تھے، جیسے رمیش چندر کا چارلس۔ چارلس کے دوست اسے اولڈ چارلس کہہ کر بلاتے تھے۔

چارلس کا بناؤ سنگھار اور پہناوا دیکھ کر کوئی اسے رمیش چندر سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ سر پر ذرا ٹیڑھا کر کے سولا ہیٹ لگاتا تھا۔ ہیٹ کے ایک طرف بھورے رنگ کا پنکھ ٹھونس لیتا تھا۔ شاید کبوتر کا پنکھ ہی ہو، لیکن کہتا تھا کہ وہ پنکھ شترمرغ نام کے ایک نایاب پرندے کا ہے، جو بھارت میں تو پایا ہی نہیں جاتا۔ چارلس کی جیکٹوں کی کہنیوں

پر انگریزوں کی طرح چمڑے کی چپیاں لگی ہوتیں۔ اس کی پتلونوں کی کریز بلیڈ کی دھار جیسی لگتی۔ اور جہاں تک چارلس کے بات کرنے کے لہجے کا سوال تھا' تو ہم لوگ جو دیسی درسگاہوں سے پڑھ کر آئے تھے' یہی سوچتے تھے کہ شاید کنگز کالج کی انگریزی نے اپنا شاہانہ مصدر کنگ چارلس کے تلفظ سے ہی قبول کیا ہو گا۔ چارلس کے ذریعے بولے گئے کچھ الفاظ کو تو ہم نے کبھی سنا بھی نہیں تھا۔ جو ہمیں کالملا" متاثر کرتا تھا' وہ تو یہ تھا کہ یہاں تک کہ آکسفورڈ ڈکشنری میں بھی یہ الفاظ نہیں ملتے تھے۔ روپوں کو وہ "چپس" کہتا تھا' سینما کو "فلکس" اور کالج کے پرنسپل کو "اولڈ پرنسی۔"

جب چارلس یونیورسٹی میں آیا تو اسے ہم ہندوستانیوں کے ساتھ ہی ہمارے ہوسٹل میں رہنا پڑا۔ اینگلو انڈین کا اپنا الگ ہوسٹل تھا' لیکن چارلس کی انگریزیت کے باوجود اسے اس خاص ہوسٹل میں داخلہ نہ مل سکا۔ لیکن چارلس اپنی وفاداریوں کا پکا تھا۔ اس نے شاید ہی کبھی ہم سے بات کی ہو یا ہمارے میس میں کھانا کھایا ہو' جب تک کہ پیسوں کی بے حد تنگی نہ آپڑے۔ اور بیچارہ انگریزی ریستوران میں "منٹ ساس" کے ساتھ "لیمب چاپس" نہ کھا پایا ہو۔ وہ سارا دن اپنے اینگلو انڈین دوستوں کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ کالج میں وہ ساتھ ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ انٹرول کا وقت وہ اپنے سکول کے دنوں اور مقامی اینگلو انڈین بستیوں میں کی گئی اپنی کرتوتوں کی یادوں کو تازہ کرنے میں گزارتے تھے۔ ہم لوگ بھی للچائے سے ان کے چاروں طرف منڈلاتے رہتے' تاکہ ان کی بات چیت کی تھوڑی بہت بھنک ہمارے کانوں میں بھی پڑتی رہے۔

جب چارلس شام کو دیر گئے ہوسٹل میں لوٹتا تھا تو ہم لوگ ہمیشہ اسے پٹانے کی طاق میں رہتے تھے' تاکہ وہ ہمیں بھی اینگلو انڈین بستیوں کے بارے کچھ بتائے۔ وہ ہمیں ایسے دیکھتا تھا' جیسے اس کے اس کہنے کو بہت کچھ تھا' لیکن ہم لوگوں کی سمجھ میں کچھ آئے گا' اس کا بھروسہ اسے قطعی نہیں تھا۔

کبھی کسی دن ہم پوچھتے کہ اس نے اس دن کیا کیا مزے کئے تو وہ چپ چاپ مسکرا کر ٹال جاتا۔ ایک دن وہ باتیں کرنے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔ اس نے ہم سے پوچھا کہ کیا کبھی ہم نے کسی گوری عورت کو ہم بستر کیا ہے؟ ہم نے کہا' "نہیں بھئی' گوری کیا؟ ہم نے تو کبھی کسی کالی عورت کو بھی چھو کر نہیں دیکھا۔" لیکن ہم سب معلوم کرنا چاہتے تھے' کہ گوری عورت کیسی ہوتی ہے۔ چارلس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس

نے صرف اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھما کر اونچی کر لیں اور ہمیں اپنی آنکھوں کی سفیدی دکھانے لگا۔ ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں جوڑے کہ ہمیں کچھ تو بتائے۔ تب اس نے ہمیں کسی شہوانی فنکار کی چالاکی سے بھرپور سارا واقعہ تفصیل سے سنایا۔ اپنے اپنے کمروں میں جاتے ہوئے ہمارے بے چین مضطرب دلوں میں چارلس کے بارے حسد کے بھنڈار اٹھ رہے تھے۔

اچانک ہی بغیر کسی خاص وجہ کے چارلس کے رنگ ڈھنگ میں تبدیلی آنے لگی۔ وہ اپنے اینگلو انڈین دوستوں کے برعکس ہم لوگوں میں زیادہ وقت گزارنے لگا۔ ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ ہندوستانی تھا۔ اب "برائین" کے بدلے اپنا گھر "بھیڑا" میں بتانے لگا۔ اس نے ہمیں یہ خفیہ بات تبھی بتای تھی کہ اس کا اصلی نام رمیش چندر تھا۔

ایک دن چارلس نے ہمیں آہستہ آہستہ آواز میں گوری عورتوں کے بارے اندرونی معلومات دیں۔ اس نے بتایا کہ انہیں ایسے ہی بڑھا چڑھا کر عزت دی جاتی ہے۔ ہمارے کانوں میں پھسپھاتے ہوئے وہ بولا کہ گوری چمڑی کے سوا ان میں کچھ خاص نہیں ہوتا۔ ہم نے کہا کہ ہم تو پہلے سے ہی ایسا اندازہ لگایا کرتے تھے۔ اب ہمیں اور بھی یقین ہو گیا۔ کیونکہ چارلس تو گوری عورتوں کو قریب سے جانتا ہے۔ خیر ہمیں خوشی ہوئی کہ چارلس کم از کم ہندوستانی عوتوں کو عزت دینے کی بات کو لے کر تو دیش بھگت تو کہلا ہی سکتا ہے۔

کچھ ہی دنوں میں ہمیں چارلس کی دیش بھگتی کی وجہ معلوم ہو گئی۔ بٹی براؤن سے اس کی خاصی نبھ رہی تھی، کہ اسے معلوم ہوا کہ بٹی کا ایک اینگلو انڈین محبوب بھی تھا، جیکب۔ حال ہی میں جیکب کی پولیس میں سارجنٹ کی نوکری لگ گئی تھی۔ بٹی نے چارلس کو چھوڑ دیا، کیونکہ چارلس کے پاس نہ تو خاکی یونیفارم تھا، نہ ہی "ایم براؤن" کی بھوری ہیلٹ اور نہ ہی اس کے کندھوں پر پنجاب پولیس کا شاندار بلا تھا۔ اس کے پاس دو سیٹوں والی موٹر سائیکل بھی نہیں تھی، جس پر بٹی کو پیچھے بٹھا کر ہوا میں اڑاتا۔ اور پھر ہر بات کے باوجود چارلس اس کے لئے "نیگرو" (بنگرو) ہی تو تھا۔

بات چارلس کے دل کو چبھ گئی۔ لیکن دل کو ٹوٹنے سے پہلے ہی ایک اور سہارا مل گیا۔ ریتلے شاہ پور کی بنجر زمین سے ایک لڑکی نے اس یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ عمر

ہو گی تقریباً" سولہ سال۔ لیکن اس کے سینے کے ابھاروں سے نسوانیت کی علامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ کسی کو اپنی طرف دیکھتے ہی اس کی نظریں جھک جاتیں' ایسی چھوئی موئی سی شرماتی تھی۔ ہمیشہ خاموش سی دکھائی دیتی۔ ہاتھ کے بنے کھدر کی سفید ساڑھی ہی پہنتی اور جنوری کے ٹھنڈے ٹھنڈے مہینے میں بھی چپل پہنے رہتی۔ جب اس لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر شرماتے ہوئے چارلس کو آہستہ سے نمستے کی' تو چارلس کا دل تھما کا تھما رہ گیا۔ چارلس کو لگا کہ ماں کے پاس رکھی سرسوتی کی تصویر سے یہ لڑکی کتنی ملتی جلتی ہے۔ اسے بچپن سے ہی وہ تصویر بہت اچھی لگتی تھی۔ بڑے سے گلابی کنول پر درخشانی سفید لباس میں سجی سرسوتی اور پیچھے برف سے ڈھکا پہاڑی سلسلہ۔ سامنے کی طرف کونے میں سونڈ اونچی کر کے نمسکار کرتا ہوا گج یکل۔ چارلس نے دل ہی دل میں سوچ لیا کہ یہ لڑکی ہو بہو سرسوتی کی مجسم صورت ہے۔ ماتھے پر لگی ننھی سی سرخ بندی سے لے کر گلابی انگلیوں والے پاؤں تک سرسوتی کی مورت ہی تو مجسم ہو کر اس کے سامنے کھڑی تھی۔ جیسے ابھی ابھی ویدوں سے نکل کر ظاہر ہوئی ہو۔ جیسے ہیمالیائی کیلاش پربت سے نکلی گنگا کی دھار میں کنول پر براجمان' تیرتی ہوئی سرسوتی چارلس کے روبرو موجود ہو۔

چارلس اچانک دیش بھگت بن بیٹھا۔ جب اس لڑکی کے ساتھ نہ ہوتا تو ہمارے ساتھ رہتا۔ اب وہ اپنے اینگلو انڈین دوستوں کو حرامی یا لونڈے باز کہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی کہتا کہ سالے دونوں ہیں--- حرامی بھی اور لونڈے باز بھی۔ ہم مان لیتے' کیونکہ ہم جانتے تھے کہ وہ ان کے بارے ہم سے زیادہ جانتا ہے۔ چارلس کے حلیئے میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ پہلے اس کے ہیٹ سے پنکھ اڑا اور پھر خود ہیٹ بھی۔ اس کی بھوری پتلون بھی ڈرامائی انداز سے غائب ہو گئی اور کہنیوں سے چمڑے والی جیکٹیں بھی۔ دسمبر کی ایک سرد رات کو ہم لوگوں کے ساتھ وہ نہر کے کنارے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور وہ پیسوں کے لئے کوئی محفوظ شرط لگانے کی تاک میں تھا۔ آخرکار اس نے اعلان کیا کہ اگر ہم اسے پانچ روپے دے دیں تو وہ اپنے کپڑوں سمیت نہر میں کود پڑے گا۔ چارلس نے شرط جیت لی اور وہ بھیگے کپڑوں میں کانپتا ہوا ہوسٹل لوٹا۔ لیکن اس کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ چمک رہا تھا۔ چارلس کی اکلوتی پتلون ٹخنوں سے چھ انچ اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ اسے بہانہ ملا ہندوستانی کپڑے پہننے کا۔ ہاتھ کے

بنے کھدر کے کپڑے سستے پڑتے تھے اور وہ ہندوستانی لڑکی بھی تو ہمیشہ کھدر کی ہی ساڑھی پہنتی تھی۔ تو سولا ٹوپی لگانے والا سوٹڈ بوٹڈ چارلس اب کھدر پوش بن گیا تھا۔

رمیش نے اپنے نئے کردار کو سنجیدگی سے لیا۔ اس تبدیلی پر زور دینے کے لئے اس کے نام کے آگے شری لگایا جانے لگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ سچے بھارتی اپنے نام سے پہلے مسٹر کی بجائے شری لگانا ہی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہم لوگوں کے نام سے پہلے اب بھی مسٹر ہی لگتا تھا۔ ہم اپنے آپ کو اس کے موازنے میں بدیشی محسوس کرنے لگے۔ رمیش ہمیں اور بھی کئی چھوٹی چھوٹی باتوں میں دیش بھگت محسوس کراتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہمیشہ اردو یا ہندی کی کتابیں ہی دکھائی دیتیں۔ وہ اکثر کالیداس' غالب اور منشی پریم چند کے بارے باتیں کرتا رہتا اور انہیں بدیشی ادیبوں سے ہر حالت میں بہتر بتاتا تھا۔ ہم لوگ کچھ نہیں بولتے تھے' کیونکہ ہمیں کچھ علم ہی نہیں تھا۔ لیکن رمیش کی نئی علمی تبدیلی کے بارے معلوم نہیں کیوں' ہمیں شک رہتا تھا۔

رمیش کا دیش بھگت کا سب سے بڑا راز تو صرف کچھ ہی لوگوں کو معلوم تھا۔ ہم لوگ اکثر دیکھا کرتے کہ وہ اپنے چمڑے کے پرس سے ایک مڑا تڑا ایک چرم پتر نکال کر بڑے غور سے پڑھا کرتا۔ جب کبھی ہم اس کے قریب چلے جاتے تو وہ اسے فوراً'' واپس اپنے بیگ میں ڈال لیتا' جیسے وہ کوئی خفیہ خط ہو۔ دراصل وہ تھا ہی خفیہ خط اور رمیش مہینوں سے اس پر کام کر رہا تھا۔ اس کے کچھ خاص معتقدوں کو اس نے بتایا کہ وہ اپنے ساتھ ان انگریزوں کی فہرست لئے گھومتا ہے' جنہیں وہ ''شوٹ'' کرنے جا رہا ہے۔ اس نے چرم پتر نکالا اور ہماری تعریفی نظروں کے سامنے پھیلا دیا۔ ہم نے نزدیک سے اس کا معائنہ کیا۔ اس میں پولیس اور بھارتی سول سروس کے کئی اہم افسروں کے نام تھے۔ آخر میں تھا پنجاب پولیس کے انسپکٹر جیکب کا نام۔ ہماری تجویز سے اس لسٹ میں اور بھی نام شامل کئے گئے۔ رمیش نے آہستہ سے چرم پتر کو تہہ کیا اور اپنے بٹوئے میں واپس رکھ لیا۔ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ کر ہم لوگوں کو ان مجرم افسروں کے رشتے داروں کے بارے ہمدردی ہو گئی۔

کئی دنوں سے ہم باقاعدہ وقت سے پہلے ہی سو کر اٹھنے لگے کہ اخبار میں رمیش کے ذریعے قتل کئے گئے افسروں کے نام پہلے پڑھ سکیں۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان مجرم افسروں کو اپنا رویہ درست کرنے کے لئے کچھ دنوں کی اور مہلت دے رہا تھا۔

جب ہم نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ساری تیاری ہو چکی ہے' بس اسے کچھ معاونوں کی ضرورت ہے۔ قدرتی ہی تھا کہ ہم لوگوں نے اپنے اپنے پرانے تعلقات کی آڑ لے کر اس سے معافی مانگ لی۔ رمیش ہم سے خفا ہو گیا' اور کہنے لگا کہ ہم سب کاہل ہیں۔ ہم لوگوں نے بدلہ لینے کا نہیں سوچا' کیونکہ ہمیں لگا کہ اس کی بات سچائی ہے۔ لیکن ہم میں سے کچھ نے سوچا کہ رمیش شاید ہمیں ایسے ہی بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیوں نہ ہم بھی اسے ذرا بنائیں۔

ہم لوگوں نے اس سے کہا کہ ہماری اپنی بھی پہلے سے ہی ایک انتہا پسند جماعت ہے۔ اگر وہ چاہے تو ہماری جماعت میں اس کا سواگت ہے۔ یہ سنتے ہی رمیش کا رنگ زرد پڑ گیا۔ لیکن جس طرح اس نے ہمیں کاہل کہہ کر شرمندہ کیا تھا' اس کے پاس اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا تھا' سوائے اس کے کہ چپ چاپ ہمارے گروہ میں شامل ہو جاتا۔ ایک رات ہم نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور شہر سے باہر کرائے پر لی گئی ایک برساتی میں اسے لے گئے۔ یہاں پہنچ کر اس کی آنکھوں کی پٹی ہم نے کھول دی۔ آنکھیں کھلتے ہی اس نے دیکھا کہ اس کے سامنے ٹوپ دھاریوں کا ایک دستہ کھڑا ہے۔ رمیش کو راز داری کا حلف دلایا گیا۔ اور لینن کی بڑی تصویر کے سامنے اس نے قسم اٹھائی کہ وہ جماعت کے مفاد کی حفاظت اپنے خون سے کرے گا اور اگر وہ اس مقصد میں ناکام رہا تو لینن کی تصویر کے اوپر بڑے بڑے حروف میں لکھے اس چیلنج کو قبول کرے گا یعنی۔۔۔ غداری کی سزا موت۔

حلف اٹھانے کے بعد رمیش جوش میں آیا ہی تھا کہ کہیں سے سیٹی کی آواز آئی۔ ایک ٹوپی پوش نے دوڑ کر آکر اطلاع دی کہ کسی کے غداری کرنے کی خبر ملی ہے۔ ہم نے اپنی اپنی پستولیں نکالیں اور رمیش کے اوپر تان کر اس سے وضاحت طلب کی۔ وہ ہکلانے تتلانے لگا اور پتے کی طرح کانپنے لگا۔ تبھی ہم میں سے کسی کی ہنسی چھوٹ گئی۔ بیچارہ رمیش خود کو بہت بے عزت محسوس کرتا ہوا گھر لوٹا۔

رمیش کے اس انتہا پسند جوکھم کی کہانی دور دور تک پھیل گئی اور لوگ اس پر ہنسنے لگے۔ یہاں تک کہ اس لڑکی کو بھی یہ واقعہ کافی دلچسپ لگا۔ رمیش کو یہ معلوم کرکے بے حد دکھ ہوا۔ کم از کم اس لڑکی سے تو اسے ایسی امید نہیں تھی۔ یہ تو ایسا تھا' جیسے سرسوتی اپنی عظمت اور توازن کو طاق پر رکھ کر نیچی سطح پر اتر آئی ہو۔ اس نے

اس پر ہنس کر اس ہتک کی تھی۔
اس کی سرسوتی نے اسے ایک بار اور نیچا دکھایا۔ یونیورسٹی کی پڑھائی درمیان میں ہی چھوڑ کر اس نے کسی توندو سرکاری افسر سے شادی کر لی۔

رمیش کا دل ٹوٹ گیا تھا اور وہ ایک بار پھر مضطرب سا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے لوگوں سے بات کرنا بھی بند کر دیا۔ دن بھر کارل مارکس' اینجلس اور لینن کی کتابیں پڑھتا رہتا۔ رمیش کی تڑپتی ہوئی آتما کے لئے کمیونزم نے مرہم کا کام کیا۔ اس سے اس کے اندر اگے تمام خوفوں کو راحت ملی اور اس کا خود اعتمادی کا جذبہ بلند ہوا۔ کئی مہینوں تک "لیفٹ بک کلب" کے تیار کئے گئے جذباتی ٹانک کے استعمال کے بعد وہ خود اوڑھے خلوت گاہ کے پردے سے ایک نئے شخص کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ہندی پڑھنے والی پیوپا اپنی لغات کو توڑ کر باہر نکلی تھی اور ایک مارکس ازم تتلی میں شگفتہ ہو گئی تھی۔ شری رمیش چندر مر گیا تھا۔ کامریڈ رمیش چندر یا کامریڈ چارلس پیدا ہوا تھا۔

پہلے کی طرح اس دفعہ بھی چارلس نے اپنے کام کو سنجیدگی سے لیا تھا۔ وہ کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا۔ اس نے تانگے والوں اور جمعداروں کی مضبوط یونین بنائیں۔ اس کے حکم پر جمعداروں نے ہڑتالیں کیں۔ سارا شہر گندگی سے بھر گیا۔ اس کے حکم سے تانگے والوں نے تانگے چلانے بند کر دیئے۔ لوگوں کا گھروں سے نکلنا رک گیا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگے کہ ایشور چارلس کو اچھی عقل دے اور اس کا دل کہیں اور پھیر دے۔ جو چارلس کو جانتے تھے' انہوں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا اور ہڑتال کے ٹوٹنے کا انتظار کرنے لگے۔

چارلس نے تانگے والوں کو ہڑتال کا حکم دیا ہوا تھا۔ ہڑتال کے لئے بہانہ ڈھونڈنا کوئی مشکل نہیں ہوتا' کبھی بھی ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ کارپوریشن نے ان کا کرایہ بڑھانے سے انکار کر دیا تھا۔ پولیس ہمیشہ ان سے پیسے مانگتی رہتی تھی۔ مجسٹریٹ آئے دن ناجائز جرمانہ ٹھونکتے رہتے تھے' اس لئے تانگے والوں نے ہڑتال کر دی۔ شہر کا آمد و رفت کا اکلوتا ذریعہ بند ہو گیا۔ چارلس جیت کی امنگ میں اڑنے لگا۔ اس نے اسی خوشی میں ہمیں بیئر پلائی۔

اگلے دن انتظامیہ نے کاروائی کرنے کی سوچی۔ تانگے والوں کی یونین کو غیر آئینی

قرار دے دیا گیا اور تانگے والوں کو حکم ملا کہ وہ دوبارہ سڑکوں پر لوٹ آئیں' ورنہ ان کے لائسنس ضبط کر لئے جائیں گے۔

ہم جانتے تھے کہ اس کا مطلب ہے مصیبت' اور چارلس نیز مصیبت کا کوئی ساتھ نہیں تھا۔ صبح ہی صبح ایک تانگہ بڑا سا سرخ جھنڈا لہراتا گھوم پھر کر شام کو ہونے والے تانگے والوں کے جلسے کا اعلان کرنے لگا۔ چارلس تانگے میں نہیں تھا' نہ ہی جلسے کو خطاب کرنے والے مقرروں میں اس کا نام تھا۔ شام کو ڈھول پر منادی کر کے ایک خبر دی گئی کہ انتظامیہ نے جلسے کو غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔

ہم سمجھ گئے کہ کیوں چارلس کا نام مقرروں کی فہرست میں نہیں تھا۔ ضرور ہی وہ کسی ضروری کام کا بہانہ بنا کر شہر سے باہر چلا گیا ہو گا' یا پھر پیٹ پکڑ کر بستر میں پڑا ہو گا۔ ہم نے اسے دیکھنے جانے کا فیصلہ کیا کہ چلو کچھ دل لگی ہی سہی۔

ریلوے اسٹیشن کے پاس چوراہے پر بھاری ہجوم تھا۔ اس مشتعل ہجوم سے تھوڑا سا ہٹ کر دو گروہ الگ الگ جمع ہوئے تھے۔ ایک گروہ تقریباً'' دو سو تانگے والوں کا جو زمین پر ہی پسر کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے عین درمیان ایک آدمی سرخ رنگ کا جھنڈا تھامے بیٹھا تھا۔ تانگے والوں سے تقریباً'' تیس گز دور پولیس والے اپنی رائفلیں تھامے چار قطاروں میں کھڑے تھے۔ ایک ایک قطار میں تقریباً'' پچاس پولیس والے تھے۔ ان کے سامنے کئی اینگلو انڈین سارجنٹ بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ ان میں جیکب بھی تھا' وہ اپنے جیک بوٹوں کو چمڑے سے مڑھے سوٹے کے ساتھ بے چینی سے تھپک رہا تھا' کیونکہ چارلس اس کے ہاتھوں سے بچ نکلا تھا۔

تبھی ایک سانولا سا' لمبا سا آدمی تانگے والوں کے گھیرے سے نکلا اور سرخ جھنڈے کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے بولنا شروع کیا۔ ماحول میں مکمل سکوت چھا گیا اور لوگوں نے اس کو سننے کے لئے اپنے کان کھڑے کر دیئے۔

''کامریڈو۔'' وہ چلایا' ''امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ ہمیں اس کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ہم لوگ مزدور ہیں اور انصاف ہمارے حق میں ہو گا۔''

ایک اینگلو انڈین سارجنٹ نے گھیرے کے درمیان پہنچ کر اسے آگے بولنے سے روکا۔ زرد رنگ کا ایک کاغذ دکھاتے ہوئے اس نے حکم دیا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر جلسہ ختم ہو جانا چاہئے۔ اس نے مقرر کو کالر سے پکڑا اور بے رحمی سے قریب کھڑے

کانسٹیبل کی طرف دھکیلا۔ کانسٹیبل نے اسے ہتھکڑی لگا کر پولیس کی وین میں ٹھونس دیا۔

اب تانگے والوں کا کوئی لیڈر باقی نہیں بچا تھا۔ ہم لوگوں نے ان کی باتیں سنیں کہ کام پر نہ جانے سے انہیں کتنا نقصان ہو رہا تھا۔ وہ یہ بھی کہتے سنے گئے کہ اگر انہیں جیل جانا پڑا، تو پیچھے ان کے بیوی بچے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔ لیڈر نے تو ساتھ چھوڑ ہی دیا تھا۔ کچھ لوگ اٹھ اٹھ کر بھاگنے لگے اور ہجوم میں جا ملے۔ "شرم کرو، کچھ شرم کرو" کی آوازوں کے باوجود اور بھی کئی ان کی تقلید کر کے بھاگ چلے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پانچ منٹ کے اندر ہی اندر جلسہ ختم ہو جائے گا۔

تبھی معلوم نہیں کہاں سے چارلس یکایک نمودار ہوا۔ ہم نے اس کی دبلی پتلی شکل کو ہجوم اور تانگے والوں کے درمیان میں چلتے ہوئے دیکھا۔ اس نے کچھ مشتعل ہوتے ہوئے اپنے بکھرے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے دبایا۔ جیسے ہی اس نے تانگے والوں کے درمیان جاکر سرخ جھنڈے کو تھاما، ہجوم میں سے صدائے مسرت گونج اٹھی۔

اس نے موجود لوگوں پر چاروں طرف ایک نظر دوڑائی اور چلانے لگا، "کامریڈو!" پھر وہ اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کیمونسٹ پارٹی کا بین الاقوامی گیت گانے لگا۔ اس کے خوفزدہ ساتھیوں میں بھی ہمت اور بہادری کی ایک لہر سی ابھر آئی۔

پولیس کمشنر جانتا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے تھا؟ ذرا سی طاقت کا استعمال ہی ان کو تتر بتر کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس نے سپاہیوں کو اپنی اپنی سنگینیں تیار کرنے کا حکم دیا۔ ڈوبتے سورج کی شفق میں سٹیل کی دو سو سنگینیں چمک اٹھیں۔ سپاہیوں نے اپنی اپنی رائفلوں پر انہیں چڑھا لیا۔ گانے کی آواز تھم گئی اور بقایا تانگے والوں میں سے کچھ اور بھی بھاگ کر ہجوم میں شامل ہو گئے۔ چارلس وہیں کھڑا رہا۔ جھنڈا اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ ایک بار پھر اس کی آواز گونجی، "کامریڈو!" اس نے پھر اپنے بازو اوپر اٹھائے اور اس کی پارٹی کے باقی لوگوں نے ایک سر میں "سرخ جھنڈے" کا گیت گانا شروع کر دیا۔

"اٹین شین!"

"اپنی بندوقوں میں کارتوس بھرو۔"

"نشانہ لو!"

دو سو سنگین والی رائفلیں کندھوں پر چڑھا لی گئیں۔ ان کی بدشکل نوکیں چارلس اور اس کے ساتھیوں کی طرف تن گئیں۔ ہمارے جسم کا خون خوف سے جمنے لگا اور ہم پسینہ پسینہ ہو گئے۔ یہ تو کوئی قانون نہیں ہے کہ جلسہ میں جمع ہونے کے باعث ہی لوگوں پر گولی چلا دی جائے۔ لیکن لگتا تھا کہ وہ ایسا ہی کرنے والے ہیں۔ کمشنر نے اپنے ہاتھ کا ڈنڈا اوپر اٹھایا ہوا تھا۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ اسے نیچے کیا۔

"فائر!"

رائفلوں کے منہ آسمان کی طرف اٹھے اور گولیوں کی بوچھاڑ کی بھیانک آواز ماحول کے سکون کو چیر گئی۔ صرف جھنڈے کو ہی نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ سرخ کپڑا چھلنی چھلنی ہو گیا تھا۔ غضب کا شور مچنے لگا۔ ہجوم خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ چارلس کے ساتھی بھی اسے چھوڑ کر بھاگ لئے۔ ان میں سے دو نے اسے بھی اپنے ساتھ پیچھے کھینچنے کی کوشش کی' لیکن اس نے انہیں جھٹک کر پرے کر دیا۔

اب اس چوراہے پر چارلس اکیلا کھڑا تھا۔ بڑے سے جھنڈے کے قریب کھڑا ایک چھوٹا سا جسم۔ رائفلوں کے منہ اب بھی اس کی طرف تنے تھے اور ان کی نوکوں سے نکلتا ہوا دھواں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ماحول پوری طرح پرسکون تھا۔ کچھ منٹوں تک چارلس ویسے ہی خاموش کھڑا منظر کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے سامنے وہ پولیس کے لوگ کھڑے تھے' جن سے وہ تہہ دل سے نفرت کرتا تھا۔

اس کے اپنے ملک کے باشندوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ چارلس کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس نے آہستہ سے سرخ جھنڈا اوپر اٹھایا اور اس کی اکیلی آواز نے ماحول کے خوفزدہ سکوت کو توڑا' "ہندی ہم چالیس کروڑ---" وہ مستی سے گاتا ہوا آہستہ آہستہ مارچ کرتا ہوا ہتھیار بند پولیس دستے کی طرف بڑھنے لگا۔

پولیس کی قطار سے جیکب باہر نکلا اور اپنا بازو تان کر چارلس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ چارلس تب تک آگے بڑھتا رہا' جب تک کہ اس کا منہ جیکب کے چہرے کے بالکل قریب نہ آگیا۔

"شٹ اپ۔" چارلس کے منہ پر ایک کرارہ طمانچہ جڑتے ہوئے سارجنٹ چلایا' "شٹ اپ!" لیکن چارلس تب بھی گاتا رہا۔

"او کے' یو باسٹرڈ' تم نے خود ہی ہمیں اکسایا ہے۔"

جیکب نے اپنے ڈنڈے کے ساتھ چارلس کو اتنا پیٹا کہ اس کے منہ سے خون گرنے لگا۔ ہماری تتلی کی جم کر دھنائی ہوئی تھی۔

پولیس نے چارلس کو اپنے ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اسے مار پیٹ کر چوراہے پر ہی بے ہوشی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ ہم اسے اٹھا کر اپنے ساتھ لائے اور اس کی تیمارداری میں مصروف ہو گئے۔ اس کی دیکھ بھال کے لئے ہم نے ایک خوبصورت سی یورپئن نرس تعینات کی۔ وہ پوری رات بے ہوشی کی حالت میں رہا۔ ہم لوگ کافی گھبرا گئے تھے۔

صبح سویرے جاکر اسے ہوش آیا۔ ہم سب چاروں طرف سے اسے گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ وہ درد سے تڑپتا دکھائی دے گا' لیکن چارلس تو اس حالت میں بھی فاتحانہ سا مسکرا رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ چلایا' ''کامریڈو' مورچہ بندی کا مقابلہ کرو۔''

اس نے جوشیلی آواز میں پھر دہرایا' ''اپنے گیتوں کے بم ان پر پھینکو۔''

''نو' نو' مسٹر---'' خوبصورت نرس نے سختی سے اسے زیادہ بولنے سے منع کیا' ''اپنے آپ کو زیادہ اکسائٹ مت کریں۔''

ابھی تک چارلس کا دھیان اس کی طرف نہیں گیا تھا۔ اب اس نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا اور بولا' ''نام ہے رمیش چندر!'' چھوٹا نام چارلس! پلیزڈ ٹو میٹ یو (آپ سے مل کر خوشی ہوئی)!''

# مرنے کے بعد

سن انیس سو پینتالیس کی ایک شام۔ مجھے بخار ہے۔ میں بستر میں پڑا ہوں' لیکن کوئی گھبراہٹ والی بات نہیں ہے' بالکل ہی گھبرانے والی بات نہیں' کیونکہ مجھے میرے حال پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے۔ میرے پاس میری تیمارداری کے واسطے کوئی بیٹھا بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر میرا بخار اچانک ہی بڑھ جائے؟ اگر میں مر ہی جاؤں؟ تو میرے دوستوں کا کیا ہو گا؟ ایک دو نہیں' سینکڑوں دوست ہیں میرے۔ اتنا مانتے ہیں سب مجھ کو۔ معلوم نہیں' اخبار والے بھی کیا کیا لکھیں گے' میرے مرنے پر! یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے بارے نہ لکھیں۔ "ٹریبون" تو شاید اپنے پہلے صفحے پر ہی میری ایک چھوٹی فوٹو کے ساتھ یہ خبر چھاپ دے۔ سرخیوں میں چھپا ہو گا---"سردا خوشونت سنگھ کا سورگ واس۔" اور پھر چھوٹے پرنٹ میں خاص خبر اس طرح ہو گی---

"صدمے کے ساتھ بتانا پڑ رہا ہے کہ گزشتہ شام 6 بجے سردار خوشونت سنگھ اچانک وفات پا گئے۔ اپنے پیچھے وہ اپنی جوان بیوی' دو چھوٹے بچوں اور لاتعداد دوستوں اور فینز کو روتا بلکتا چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ کو یاد دلا دیں کہ وہ اپنی مستقل رہائشی مقام دہلی سے تقریباً" پانچ برس پہلے لاہور میں آکر بس گئے تھے۔ ان ہی سالوں کے دوران انہوں نے عدالت اور سیاست میں اپنا ایک خاص مقام بنا لیا تھا۔ سارے صوبے میں ان کی وفات پر سوگ منایا گیا۔

"سورگ واسی سردار جی کی رہائش گاہ پر اظہار افسوس کے لئے آنے والے لوگوں میں اہم تھے--- وزیراعظم کے ذاتی مشیر' چیف جسٹس کے ذاتی مشیر' کئی وزیر اور ہائی

کورٹ کے جج۔ رپورٹروں کو دیئے گئے اپنے بیان میں عزت ماب چیف جسٹس نے کہا۔۔۔ ''اس شخص کی وفات سے پنجاب نے مستقبل کا ایک چمکدار ستارہ کھو دیا۔'' ۰

خبر کے نیچے ایک اعلان ہو گا۔۔۔

''آخری رسومات آج صبح دس بجے ہوں گی۔''

مجھے اپنے دوستوں اور اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔ اپنی ہی موت پر بہتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو میں بمشکل روک لیتا ہوں۔ لیکن اپنے آپ میں ایک عجیب سے فخر کا احساس بھی محسوس کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ لوگ میرا ماتم منائیں۔ شام ہو گئی ہے۔ اب تک سب اخبار والوں کو میری موت کی خبر لگ چکی ہو گی۔ اس لئے میں اپنے مردے میں سے نکل کر باہر آتا ہوں۔ گھر کی سنگ مرمر کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر مرنے کے بعد لوگوں کی نظروں سے اوجھل بیٹھ جاتا ہوں۔

صبح اخبار مجھے اپنی بیوی سے پہلے ہی مل جاتا ہے۔ چھینا چھپٹی کے بکھیڑے کا سوال ہی نہیں تھا' میں تو دروازے کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ ویسے بھی میری بیوی کو اخبار کا خیال ہی کہاں تھا؟ وہ تو بیچاری میری لاش کے چکر لگا رہی تھی۔

''ٹربیون'' نے میرے ساتھ برا کیا۔ صفحہ تین پر پہلے کالم میں سب سے نیچے ریٹائرڈ سرکاری افسروں کی موت بارے اطلاعات میں ایک چھوٹے سے چوکھٹے میں میرا نام تھا' بس! مجھے بہت غصہ آیا۔ ضرور اس بکواسی' خاص رپورٹر۔۔۔ شفیع کی کرتوت ہو گی۔ اسے میں اچھا ہی کہاں لگتا تھا؟ لیکن اتنا تو نہیں سوچا تھا کہ مرنے کے بعد مجھے تھوڑی سی اہمیت دینے سے بھی کترا جائے گا۔ جو بھی ہو' سارے صوبے میں میری موت سے پھیلی دکھ کی لہر کو وہ اپنے اخبار تک پہنچنے سے نہیں روک سکے گا۔ میرے دوست اس کا مکمل بندوبست کریں گے۔

ہائیکورٹ کے پاس اخبار جلدی پہنچ جاتا ہے۔ میرے وکیل دوست منظور قادر کے گھر تو صبح ہونے سے پہلے ہی۔ ایسا نہیں ہے کہ منظور قادر جلد اٹھ جاتے ہوں۔ بلکہ نو بجے سے پہلے تو اس گھر میں کوئی ہلتا بھی نہیں۔ لیکن منظور قادر اصولوں کا پکا ہے اور اخبار اس کے پاس سویرے سویرے پہنچ ہی جانا چاہیئے' چاہے ہی وہ اسے دیکھے یا نہ دیکھے۔

ہمیشہ کی طرح قادر اور اس کی بیوی نو بجے تک بستر میں ہی تھے۔ رات دیر تک

کام کرتا رہا تھا۔ بیوی کو تو ویسے بھی سونے کا شغل تھا۔ ٹرے میں اخبار رکھ کر آئی۔ ساتھ میں گرم لیموں پانی کا گلاس بھی۔ سگریٹ کے کشوں کے درمیان قادر گرم پانی کی چسکیاں لیتا رہا۔ قبض کی شکایت کے باعث اس کا روز کا کام تھا۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہی اس نے سرخیوں پر نظر ڈالی۔ اصلی اخبار تب پڑھتا تھا' جب سگریٹ اور لیموں اپنا کام کر رہے ہوتے۔ میری موت کی خبر اس کے لیٹرین جانے کی محتاج تھی۔

تو قادر کا لیٹرین جانے کا وقت آہی گیا۔ ایک ہاتھ میں اخبار ہے' ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہے۔ سیٹ پر آرام سے بیٹھ گیا ہے۔ اخبار پر اچھی طرح نظر ڈالتا ہے۔ پہلے چھوٹی موٹی خبروں پر دھیان جاتا ہے۔ صفحہ تین کے پہلے کالم پر نظر پڑتے ہی لمحہ بھر کو سگریٹ پینا روک دیتا ہے۔ سوچتا ہے کہ کیا اٹھ کر بیوی کو خبر سنائے؟ نہیں' نہیں۔ یہ ٹھیک نہیں لگے گا۔ دکھاوٹی پن لگے گا۔ قادر منطقی انسان تھا۔ شادی کے بعد تو اور بھی ہو گیا تھا۔ بیوی جو جذباتی اور بات بات پر طوفان اٹھانے والی ملی تھی۔ اور اب تو دوست بیچارہ مر ہی گیا' کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ بیوی کو بتایا تو ابھی رونا دھونا مچا دے گی۔ اس لئے اسے تو خبر اس طریقے سے دینی ہو گی' جیسے کچھ خاص نہ ہوا ہو' صرف ایک مقدمے میں ہار ہو گئی ہو۔

قادر اپنی عورت کو جانتا تھا۔ اس نے اسے سرسری طور پر بتایا۔ جیسا کہ اسے معلوم تھا' سنتے ہی وہ زور زور سے رونے لگی۔ اس کی دس سال کی بچی کمرے میں بھاگی آئی۔ ماں کو روتا دیکھ' بغیر سوچے سمجھے اس نے بھی رونا شروع کر دیا۔ قادر نے سوچ لیا کہ اب سختی برتنی پڑے گی۔

اس نے زور سے کہا' "یہ سب شور و غل کیوں مچا دیا ہے؟ اس سے کیا جانے والا لوٹ کر آجائے گا؟"

بیوی کو معلوم تھا کہ اس سے بحث کرنا بیکار ہے۔ جیت تو اسی کی ہونی تھی۔ وہ بولی' "سنو' ہمیں ابھی فوراً" ان کے گھر چلنا چاہئے۔ اس کی بیوی بیچاری پر کیا گزر رہی ہو گی؟"

قادر نے کندھے جھٹکا دیئے' "بھئی' میرے تو بس کی بات نہیں ہے۔ تسلی تو میں بھی دینا چاہتا ہوں' اس کی بیوی کو' یعنی بیوہ کو' لیکن میرے موکلوں کی طرف میرا فرض پہلے آتا ہے۔ مجھے کورٹ میں آدھے گھنٹے کے اندر ہی پہنچنا ہے۔"

تو قادر سارا دن کورٹ میں رہا اور اس کی بیوی گھر پر۔

شہر کے بڑے پارک کے پاس ہی میرا ایک اور دوست کھوسلہ رہتا ہے۔ اونچے طبقے کے محلے میں مکان ہے۔ گھر میں بیوی' تین بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ پیشے سے جج ہے اور دفتر شاہی میں خاصہ رعب اور نام ہے۔

کھوسلہ جلدی اٹھنے والوں میں سے ہے۔ جلدی اٹھتا ہے' کیونکہ یہی ایک وقت ہے' جو اس کا اپنا ہوتا ہے۔ دن بھر کورٹ میں کام کرتا ہے' شام کو ٹینس کھیلنا ضروری ہے۔ اسی وقت تھوڑی دیر بیوی اور بچوں کے ساتھ ہی گزارنی ہوتی ہے۔ اس کے یہاں ملنے جلنے والے بھی بہت آتے ہیں۔ کافی مقبول شخص ہے۔ بچپن سے ہی اسے اپنی تیز طراری کا احساس تھا۔ چھوٹی عمر میں ہی اس کے بال جھڑنے شروع ہو گئے تھے اور ماتھا کافی دور تک گنجا ہو چکا تھا۔ شاید قدرت نے اسے اس کے روپ کے ذریعے اس کی باصلاحیت ہونے کی تصدیق کی تھی۔ جتنا زیادہ وہ آئینے میں اپنے سر کو دیکھتا' اتنا ہی زیادہ مطمئن ہوتا رہتا ہے کہ وہ زندگی میں کچھ غیر معمولی کرنے والا ہے۔ اس لئے وہ سخت محنت کرنے لگا۔ وہ کلاس میں اول آتا اور مقابلے کے امتحان میں سب سے اول آیا۔ ملک میں ہونے والے بڑے سے بڑے مقابلے کے امتحانات میں اونچے اونچے درجے حاصل کرکے اس نے اپنی خود اعتمادی کو اور بھی مضبوط کر لیا۔ کچھ سالوں تک وہ اپنی نوکری اور اپنے آپ سے مکمل مطمئن ہو کر جیتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے پورا بھروسہ ہو چکا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں پوری طرح کامیاب ثابت ہوا ہے۔ لوگ تو ایسا کہتے ہی تھے۔

کچھ سالوں کے بعد اسے لگا کہ یہ سب محض ایک فریب تھا۔ جتنی بار وہ اپنے گنے چنے بالوں میں کنگھی کرتا اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا' اسے محسوس ہوتا کہ ابھی کافی کچھ باقی ہے' جو وہ حاصل نہ کر سکا تھا۔ اس جیسے ہزاروں بااختیار افسر تھے۔ سب اپنی اپنی زندگی میں کامیاب کہلاتے تھے۔ سول سروس ہی سب کچھ نہیں تھی' اسے کچھ اور بھی کرنا چاہئے۔ وہ لکھنا شروع کرے گا۔ اسے معلوم تھا کہ لکھنے کی قابلیت اس میں ہے' تو کھوسلہ نے لکھنا شروع کر دیا۔ اچھا لکھنے کے لئے اس نے پڑھنا بھی شروع کیا۔ ایک بڑا کتب خانہ بنا کر باقاعدہ دفتر جانے سے پہلے کچھ وقت وہاں گزارنے لگا۔

آج صبح بھی کھوسلہ لکھنے کے موڈ میں لگ رہا تھا۔ اس نے اپنے لئے ایک کپ

چائے بنائی اور آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پنسل منہ میں دبا کر سوچنا شروع کیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھے۔ تب سوچا کہ چلو اپنی ڈائری ہی لکھ ڈالے۔ کل کا دن ایک ضروری مقدمے کو سننے میں گزرا تھا۔ مقدمہ کچھ دن اور چلنے والا تھا۔ عدالت ٹھسا ٹھس بھری ہوئی تھی' اور لوگوں کی نگاہیں اسی پر جمی تھیں۔ یہ موضع ٹھیک جم رہا تھا۔ اس نے اسی موضوع پر لکھنا شروع کر دیا۔

اخبار لے کر آئے نوکر کے دروازہ کھٹکھٹانے سے اس کا عمل ٹوٹا۔ اخبار کھولا---

چلو عملی زندگی کی حقیقتوں پر بھی کچھ نظر ڈال لیں۔

کھوسلہ کو قومی اور بین الاقوامی اہمیت کے موضوعات سے زیادہ دلچسپی لگتی تھی' سماجی قسم کی خبریں' شادی بیاہ' مرنے جینے وغیرہ کی خبریں۔ اس نے سیدھا ہی صفحہ تین کھولا۔ پہلے کالم پر نظر پڑتے ہی وہ تن کر بیٹھ گیا۔

نوٹ بک میں پنسل پھنسا کر' کھانستے ہوئے اس نے اپنی شریمتی جی کو خبر سنائی۔ جمائی لے کر شریمتی جی نے اپنی لمبی خوابیدہ پلکیں کھولیں۔

"تب تو آج ہائیکورٹ بند رہے گا؟" وہ بولیں۔

"ہائیکورٹ ایسے ہی چھوٹی موٹی باتوں پر بند نہیں ہوتا۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر مجھے وقت ملا تو راستے میں ان کے یہاں تھوڑی دیر ہو آؤں گا یا پھر ہم لوگ اتوار والے دن چلے چلیں گے۔"

کھوسلہ لوگ نہیں آئے۔ اور بھی کتنے دوست یار میری ماتم پرسی کے لئے نہیں آئے۔ اور میں تھا کہ یہی سوچ سوچ کر بے حال ہوا جا رہا تھا کہ بیچارے میری موت کی خبر سن کر کتنے دکھی ہوئے ہوں گے۔

دس بجے کے قریب میرے گھر کے سامنے تھوڑی سی بھیڑ جمع ہو گئی۔ اس میں یادہ تر ایسے لوگ تھے' جن کے آنے کا میں نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ عدالت کے لباس میں کچھ وکیل تھے اور باقی کے تھے تماش بین۔ میرے دو دوست بھی آئے ہوئے تھے' لیکن وہ بھیڑ سے تھوڑی دور ہو کر کھڑے تھے۔ ایک تو فنکار سا نظر آتا تھا' پتلا سا' لمبا سا۔ ایک ہاتھ میں سگریٹ تھامے تھا اور دوسرے سے اپنی لمبی زلفوں کو بار بار پیچھے کر رہا تھا۔ ادیب آدمی تھا۔ میت کی رسومات وغیرہ میں حصہ لینے جیسی باتوں پر اس کا کوئی عقیدہ نہیں تھا' لیکن سماجی فرائض کو نبھانے کے لئے ایسے مواقع پر شکل تو دکھانی

پڑتی ہے۔ وہ ناک بھوں سکوڑ رہا تھا۔ مردے سے دور ہی رہنا چاہئے' کہیں چھوت وغیرہ لگ جائے تو! اس لئے لگاتار سگریٹ پیتے ہوئے اس نے اپنے اور باقی لوگوں کے درمیان دھوئیں کی دیوار کھڑی کر لی۔

دوسرا دوست کیمونسٹ تھا' ناٹاسا' گھنگھریالے بالوں والا' خرانٹ سی قسم کا انسان۔ اسے دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ اندر کتنا بڑا جوالہ مکھی دبائے رکھتے ہیں یہ لوگ۔ وہ ہر ایک چیز کو مارکس ازم نظروں سے دیکھنے کا عادی تھا۔ جذبات کی اس کے لئے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ موت وغیرہ تو بالکل غیر معمولی قسم کی باتیں تھیں۔ جو بات اہمیت رکھتی تھی' وہ تھی کسی چیز کا مقصد۔ اس نے آہستہ سے ادیب کو پوچھا---

''تم کہاں تک ساتھ چلو گے؟''

''میں تو سوچتا ہوں' کافی ہاؤس تک چلا جاؤں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا شمشان گھاٹ تک جاؤ گے؟''

''نہیں یار۔'' کیمونسٹ بولا' ''دراصل مجھے تو دس بجے ایک میٹنگ میں جانا تھا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ساڑھے نو بجے تک فارغ ہو جاؤں گا۔ لیکن تم جانتے ہو' ہمارے دیش کے لوگوں کو وقت کی ذرا بھی قدر نہیں ہے۔ اچھا پھر ابھی تو میں اپنی پارٹی کے دفتر میں جا رہا ہوں۔ ساڑھے گیارہ کے قریب تم کو کافی ہاؤس میں ملتا ہوں۔ اگر موقع ملے تو' یار' ذرا مردہ گاڑی والے ڈرائیور سے پوچھنا کہ وہ تانگے والوں کی یونین کا ممبر ہے کہ نہیں؟ چلتا ہوں---''

تھوڑی دیر بعد مردہ گاڑی میرے دروازے پر آپہنچی۔ ایک بھورے رنگ کا گھوڑا جتا ہوا تھا۔ گھوڑے اور اس کے مالک کو موقع کی سنجیدگی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ کوچوان پان چباتا ہوا آرام سے بیٹھا تھا اور بھیڑ کو دیکھ رہا تھا۔ اندازہ لگا رہا تھا کہ ان میں سے کسی سے بخشش وغیرہ ملنے کی امید ہے کہ نہیں؟ گھوڑے نے وہیں پر موتنا شروع کر دیا۔ اینٹوں کے فرش پر چھڑکتی دھار کے چھینٹوں سے بچنے کے لئے بھیڑ تھوڑی بکھر گئی۔

لوگوں کو زیادہ دیر تک رکنا نہیں پڑا۔ میری لاش کو سفید کپڑے میں لپیٹ کر نیچے لایا گیا اور مردہ گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ کچھ تھوڑے سے پھول بھی ارتھی کے اوپر ڈال دیئے گئے۔ اب جلوس کوچ کے لئے تیار تھا۔

ہمارے روانہ ہونے سے پہلے ایک اور دوست اپنی سائیکل لے کر پہنچا۔ دیکھنے سے ہی لگ رہا تھا کہ کوئی بہت زیادہ سنجیدہ پروفیسر ہے۔ رنگت میں تھوڑا سا سانولا' جسم سے ذرا تھتھلا۔ سائیکل کے کیریئر پر کئی کتابیں دبی ہوئی تھیں۔ ارتھی والی مردہ گاڑی کو دیکھتے ہی وہ سائیکل سے اتر گیا۔ مردوں کے لئے اس کے دل میں بڑی عقیدت تھی' اور وہ بے کھٹک ظاہر بھی کرتا تھا۔ سائیکل کو ہال کمرے میں رکھ کر اسے چین لگا دی۔ پھر بے فکر ہو کر بھیڑ میں جا ملا۔ جب میری بیوی مجھے آخری بار وداع کرنے آئی' تو بیچارے کی آنکھیں بھر آئیں۔ اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی کتاب نکال کر اس کے صفحے پلٹنے لگا اور بھیڑ کو چھانٹتا ہوا میری بیوی کی طرف بڑھا۔ بھیگی آنکھوں سے اس نے وہ کتاب میری بیوی کو نذر کر دی۔

"میں آپ کے لئے گیتا کی یہ کتاب لایا ہوں' اس سے آپ کو سکون ملے گا۔"

جذبات کے تابع ہو کر بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھنے کے لئے وہ پیچھے ہوا اور آہ بھرتے ہوئے اپنے آپ میں ہی بڑبڑانے لگا---

"یہی انسانی زندگی کا اختتام ہے۔ یہی حقیقت ہے۔"

عام قول و بیان کو دہراتے رہنے کا اسے شوق تھا۔ لیکن اس کی نظر میں بار بار دہرائی جانے والے ان عام قول و بیان کی بھی اپنی اہمیت تھی' اپنی الگ بنیاد۔

وہ دل ہی دل میں بولا' "انسانی زندگی پانی کے بلبلے کی طرح ہے۔ بلبلے کی طرح ہی لمحاتی!"

"لیکن کوئی مر کر ختم نہیں ہو جاتا۔ مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا' صرف شکل تبدیل کرتا ہے۔"

پروفیسر اپنے ہی دھیان میں کھونے لگا۔ سوچ رہا تھا کہ اس کے دوست نے اب کون سا نیا کپڑا پہنا ہو گا۔

تبھی پاؤں کے درمیان اسے کچھ ہلچل محسوس ہوئی۔ ایک چھوٹا کتا پروفیسر کے پاؤں کے درمیان پھدکتا ہوا اس کی پتلون کو چاٹ رہا تھا۔ آدمی رحم دل قسم کا تھا۔ اس نے جھک کر کتے کو تھتھپایا اور اپنے ہاتھ چٹوانے لگا۔

پروفیسر بے چین سا معلوم ہونے لگا۔ اس کا دل پھر بھٹک رہا تھا۔ اس نے لاش کو دیکھا اور پھر پاؤں کے درمیان کھیلتے چھوٹے کتے کو۔ آخر یہ کتا بھی تو ایشور کی ہی

تخلیق ہے---

جلوس آگے بڑھ رہا تھا۔ شیشے کے تابوت میں لیٹا میں سب سے آگے تھا۔ پیچھے پیچھے کوئی درجن بھر لوگ چل رہے تھے۔ جلوس ندی کی طرف بڑھنے لگا۔

بڑی سڑک کو پار کیا تو دیکھا' سارے لوگ میرا ساتھ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ وکیل تو ہائی کورٹ کے پاس ہی مڑ گئے۔ میرا ادیب دوست سگریٹ پیتا ہوا کافی ہاؤس کے پاس جاکر رکا۔ مقامی کالج کے پاس پہنچ کر پروفیسر نے بھی مجھے آخری بار موہ بھری نظر سے دیکھا اور کلاس روم کی طرف جاتی ڈگر پر بڑھ گیا۔ باقی ماندہ بھی ضلع کچہری تک پہنچتے پہنچتے غائب ہو گئے۔

میں اپنے آپ کو ننگا محسوس کرنے لگا۔ مجھ سے بھی گئے بیتے لوگوں کے جنازے میں بھیڑ کی بھیڑ جاتی ہے۔ میونسپلٹی کی گاڑی میں لدی ہوئی بھکاری کی لاش کو کم از کم دو جمعدار کھینچ کر لے جاتے ہیں۔ مجھے کھینچنے والا صرف ایک ہی ڈرائیور تھا اور وہ بھی اس شخص کے وجود کی عظمت سے بے خبر' جس کی لاش کو وہ آخری سفر کے لئے جا رہا تھا۔ اور رہی گھوڑے کی بات' تو گھوڑے کی گستاخی کا تذکرہ نہ ہی کریں تو اچھا۔

شمشان بھومی کا راستہ بدبو کے مختلف مقامات سے ہوکر گزرتا تھا۔ آخری حد تو اب آئی' جب بڑی سڑک کو چھوڑ کر شمشان گھاٹ کی طرف جانے والی تنگ سڑک پر پہنچے۔ شہر کی تمام گندگی اور غلاظت سے بھرا اکلوتا نالہ اسی سڑک کے کنارے ساتھ ساتھ بہتا تھا۔ نالے کی تھمی ہوئی کالی گندی سطح پر لگاتار بلبلے اٹھ رہے تھے۔

خوش قسمتی سے مجھے موقع دیا گیا کہ میں اپنی موت کے بعد ملنے والی اہمیت کے بارے اپنی غلط فہمیوں پر ایک بار پھر غور کر لوں۔ ڈرائیور نے شمشان گھاٹ کی طرف مڑنے والی سڑک پر ایک بہت بڑے پیپل کے درخت کے نیچے مردہ گاڑی کو جا روکا۔ یہ تانگوں کا اڈہ ہے۔ یہاں گھوڑوں کے پانی پینے کے لئے ایک ناند بھی ہے۔ گھوڑے کو پانی پینے کے لئے چھوڑ کر ڈرائیور دوسرے تانگے والوں کے پاس بیڑی سلگانے چلا گیا۔

تانگے والوں نے ارتھی کے پاس آکر گھیرا ڈالا اور تاک جھانک کرنے لگے۔

ایک نے کہا' ''اماں' امیر آدمی معلوم ہوتا ہے۔'' دوسرے نے پوچھا' ''اس کے ساتھ تو کوئی بھی نہیں ہے؟ ارے کیا یہ بھی کوئی انگریزی رسم و رواج ہے کہ جنازے کے ساتھ کوئی نہ جائے؟''

اب تک میں پوری طرح سے تنگ آچکا تھا۔ میرے پاس تین راستے تھے۔ ایک تو تھا کہ سیدھے شمشان گھاٹ چلا جاؤں اور وہاں پہنچنے والے باقی لوگوں کی طرح اپنے آپ کو شعلوں کے حوالے کر دوں۔ جل کر ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جاؤں یا پھر شاید کسی دوسری جنس میں جنم مل جائے۔

دائیں طرف سے نکلتی ہوئی دوسری سڑک شہر کی طرف جاتی تھی۔ اس سڑک پر طوائفوں اور دوسرے بدنام لوگوں کی بستی تھی۔ شرابی' جواری اور طوائف باز قسم کے ان لوگوں کی اپنی ایک الگ ہی دنیا تھی--- طرح طرح کے سنسنی خیز تجربات سے بھری۔

تیسرا راستہ تھا' واپس اپنے گھر کی طرف مڑ جانے کا۔ فیصلہ کرنا مشکل لگ رہا تھا۔ ایسے موقع پر سکہ اچھال کر "ٹاس" (فیصلہ) کرنا ہی کام آتا ہے۔ اس لئے میں نے سکہ اچھال کر فیصلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ سیدھا پڑا تو میں اس دنیا کو چھوڑ کر دوسری دنیا کی طرف چل دوں گا۔ الٹا پڑا تو سنسنی خیز تجربات کی کھوج میں بدنام بستی کا رخ کروں گا۔ اگر نہ سیدھا پڑا' نہ الٹا اور سکہ اپنے کنارے پر کھڑا ہی ہو گیا تو میں پھر اپنی اسی بے کیف گھسی پٹی زندگی میں واپس لوٹ جاؤں گا' جس میں نہ تو کوئی جوکھم ہے اور نہ ہی جینے کے بارے کوئی امنگ یا اشتیاق۔

# ”ناقابل فراموش“

# ”سیف و قلم“

لافانی کتاب ”ناقابلِ فراموش“ کا دُوسرا حصہ

★★★ سردار دیوان سنگھ مفتوں کی کتاب ’ناقابلِ فراموش‘ ان کی زندگی کا زبردست کارنامہ اور اُردو زبان میں ایک ایسا اضافہ ہے، جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔

★★★ اُنہوں نے اپنی زندگی کی پیچیدہ اور طویل راہوں سے اپنے منتشر نقوشِ قدم کو بڑی دیدہ وَری کے ساتھ چُن چُن کر اِس سلیقے کے ساتھ الفاظ کے سانچے میں ڈھالا ہے کہ جو اس کتاب کو غور سے پڑھے گا، اس کی زندگی کے راستوں پر ایسے چراغ جگمگا اُٹھیں گے، جن کی مستقل روشنی میں وہ بے خوف وخطر آگے بڑھے گا، اور کسی نشیب و فراز یا کسی موڑ پر وہ ٹھوکر نہیں کھا سکے گا۔

★★★ رُوح میں بالیدگی اور عقل میں روشنی پیدا کرنے والی سبق آموز اور عبرت انگیز کتابیں ”ناقابلِ فراموش“ اور اس کا دُوسرا حصہ ”سَیف و قلم“۔

★★★ برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ عظیم مذہبی و سیاسی شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد نے سردار دیوان سنگھ کی مشہور غیر فانی تصنیف ”ناقابلِ فراموش“ کو سب سے عظیم ترین کتاب قرار دیتے ہوئے سردار صاحب کا تاحیات وظیفہ مقرر کر دیا۔

★★★ میری دِلی آرزو ہے کہ اس کتاب کو بہمہ وجوہ فروغ حاصل ہو اور حکومتِ ہند اس کے بعض حصوں کو نصاب میں داخل کر کے آئندہ نسلوں تک اُس روحِ شرافت کے چشمے کو پہنچا دے، جو اب عنقریب خشک ہو جانے والا ہے۔ کاش ایسی کتاب کسی زندہ قوم میں شائع ہوتی۔ (جوشؔ)

★★★ یہ کتاب اِسی ناقابل فراموش ہستی کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے اور اِس قدر دِلچسپ ہے کہ کم از کم اس کے مطالعہ میں مجھے اِتنا ہی لطف آتا ہے جتنا غوث علی شاہ کے ”تذکرہ غوثیہ“ کے مطالعہ میں۔ (علامہ نیاز فتح پوری)